DAMAGE BOOK

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL LIBRARY

OU_222154

UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۱۱۵۲ ۳۳۳ Accession No. ۱۳۳۰۹

Author منشی پریم چند

Title واردات

This book should be returned on or before the date last marked below.

واردات

از

منشی پریم چند

مکتبہ جامعہ دہلی

بار اول ۵۰۰ — قیمت عہ

خواجہ برقی پریس دہلی

فہرست

۱۔	شکوہ شکایت	
۲۔	معصوم بچہ	
۳۔	بدنصیب ماں	۳۲
۴۔	شانتی	۵۲
۵۔	روشنی	۷۰
۶۔	ڈائن	۸۱
۷۔	نئی بیوی	۱۰۲
۸۔	گلی ڈنڈا	۱۲۲
۹۔	سوانگ	۱۳۴
۱۰۔	انصاف کی پولیس	۱۴۹
۱۱۔	غم نداری	۱۶۶
۱۲۔	مفت کرم داشتن	۱۸۱
۱۳۔	قاتل کی ماں	۱۸۹

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصّہ تو اسی گھر میں گذر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ بازار سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے، نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بار بار کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں، ٹٹ پونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے، اور وہ انھیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا۔ چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو

تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا، بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجہ کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کرلی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر آپ سٹپو نجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھیں نے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلالیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیئے بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے۔ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی، ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤگی میں ایک سنار کو جانتا ہوں، میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کرسکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا، تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائیگا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے اُن کے حوالے کئے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے

نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیتے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد
جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بد نما کہ دیکھ کر گھن آتی
تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو
ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ ان
کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلاش، بے سروسامان
ہیں۔ ان کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک ایک
صاحب قرض مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے
مگر ایسا کبھی نہ ہوا کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے
دو بار کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں
روپے تو دے آئے، اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمہارے وہ
دوست، تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب
نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی
کرو، مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے
کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے
انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر
سمجھتی رہے، چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں
بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے
جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کر لے اسے
کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دم
آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے
کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آکر مرتا ہے، کوئی

کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو دو چار پائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی با افراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لئے انھیں چار پائی بھی چاہئے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہئے، ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے، جاتی بنے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی تندکا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت انھیں دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے، مگر اس مرد خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے، وہ آپ کا دوست ہے شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں، آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔ کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، بد دماغ ہیں، خوشامد پسند ہیں، ان کے پاس کیسے جائیں۔ دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمتگار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمتگار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی، مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے

مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے۔ مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں، بڑا فرمانبردار ہے پرلے سرے کا ایماندار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا۔ آدمیت کی کوئی علامت اُس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں، بے ایمان نہ تھا، مگر احمق اوّل نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھا جاتا ہے۔ کمبخت دوکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصّہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سُور کے کان اُکھاڑ لوں، مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دُور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اُسے قریب نہ آنے دیتے۔ اِس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے۔ اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو اُن عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اُس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے، گویا سارے کمرہ میں زلزلہ آگیا ہو۔ اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔ سویرے سو کر اُٹھی تو دیکھتی ہوں کمرہ میں جھاڑو

دی ہوئی ہے، ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا "دیکھتی کیا ہو، آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں، ہوا ہی ڈانٹنے لگتی ہو" لیجئے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرہ میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازہ پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُن کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب ایک تو کام نہ کرے، دوسرے آنکھیں دکھائے اُس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کُرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانہ میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں، میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائیگا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی شدت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا، غریبوں کو کیا گذرتی ہے، اس کا بھی غم تھا، لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا

افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب روساء اور اُمرا کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہوئی ہو تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر میں نے تو اُسے جواب دیدیا۔ آپ نے کیا کیا کہ اپنا کوٹ اُتار کر اس کے حوالہ کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے۔ وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے، آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے جب نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں، مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشہ میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے، تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے۔ یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہئے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک جو چیز طلب کروں اُسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں مطلق عذر نہیں، مگر روپیہ میں دیدوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں

ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بچارے اپنے لئے بھی کبھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اُسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور، کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے بھی مٹھائی کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انھیں بخیل کہونگی، بد شوق کہوں گی، مُردہ دل کہوں گی، فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اُسے میں حرص نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں آپ کی منکسر مزاجی کا یہ عالم ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی تو دُور کی بات ہے، اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعائتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں، آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسّو اور پستو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے، میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروّت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو

وہ ذہنیت دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے یا جس پر اعتبار ہوتا ہے، اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بغیر فضول سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی! افسر بھی انسان ہیں۔ اُس کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو جب اُس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے، یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے، مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں، موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ میں نے کہا اپنے برادرِ مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں، آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا، لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا۔ کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا۔ ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے، ابھی کیا جواب آ سکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے

ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے، محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا، کیا ہوا تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا، یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچسو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہئے۔ دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچسو ہو، ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہی ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے۔ بچارے گھر کی مرمّت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمانداری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے گھڑنے نہیں آتے مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا، یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلّہ خریدا تھا۔ اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہوجاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ اُن پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شترِ بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے، مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اُڑائے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جونہی لڑکے واپس آتے، پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں، اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا بھلا لڑکوں پر کیا رُعب ہو سکتا ہے۔ اباجان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اُن کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ اُن کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے، تو اباجان کی ہی صحت کون بہت اچھی تھی بچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہوجاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا اُڑانے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے

سکھا رہے تھے، گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اُس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہونگے میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجئے۔ بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انھیں سُدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑئیے مت۔ لگے باتیں بنانے ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لیجاتے تھے، لڑکا سر ٹپک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتشبازیاں چھوٹیں گی، غبارے اُڑیں گے، ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ اُن پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں، کرکیٹ، فٹ بال، ہاکی، ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں، گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دونگے چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے پیدا ہو نکل آئیں جو جہیز لینے سے احتراز کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا، اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائیگی میں نے جہاں جہاں پیغام دئیے، جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی

جب اس طرح ایک پورا سال گذر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی حضرت بھی راضی ہو گئے کیونکہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی ۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی ۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی ۔ یہ رسم بیہودہ ہے ۔ یہ رسم بے معنی ہے ، یہاں روپے کی کیا ضرورت ! یہاں گیتوں کی کیا ضرورت ؟ ناک میں دم تھا کیوں ، وہ کیوں ؟ یہ تو صاف جہیز ہے ۔ تم نے میرے منہ میں کالکھ لگا دی ۔ میری آبرو ڈبا دی ۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازہ پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر رد و قدح ہو رہی ہے ۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی ۔ اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں ۔ میں نے بھی برت رکھا لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں ۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں ۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا ، کھانا کھایا ۔ خیر ۔ رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی ۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے ۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں ۔ لڑکی دان کی چیز نہیں ، دان روپے پیسے کا ہوتا ہے ۔ جانور بھی دان دئے جا سکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے ۔ کتنا سمجھاتی ہوں ، صاحب پرانا رواج ہے ۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے ۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں ، مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی ۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی ؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے ۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے ۔ پیروں پڑی ، یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو ۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی ۔ آخر مجھے رونا آ گیا ۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے ، یہ مجھے منظور نہ تھا ۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی ۔ آپ گھر

جھانکنے تک نہیں، اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر مجھے عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں، ان میں وہ کونسی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں، مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا اشن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے، ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے، بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں اور ایک پرزہ کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول اور نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں، اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ، اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

معصوم بچہ

(۱)

وکو لوگ براہمن کہتے ہیں۔ اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے۔ میرے سائیس اور خدمت گار مجھے زور سے سلام کرتے ہیں، گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا وہ شاید مجھ سے پالاگن کی توقع رکھتا ہے۔ میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ میری کبھی اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں، جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے، لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں۔ تیز مزاج آدمی ہے۔ بات کی مطلق برداشت نہیں۔ ایسے بہت کم آدمی ہیں جن سے اس کی دوستی ہو۔ سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسرِ شان سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا، نہ میلے تماشے میں جاتے دیکھا۔ حیرت یہ ہے کہ اُسے بھنگ بوٹی سے بھی شوق نہیں جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے۔ وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا، اور نہ اُسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے۔ بالکل ناحرف شناس آدمی ہے لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے، اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اسی شان سے قابض ہیں، گویا انھوں نے خود پیدا کی ہو، تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے۔ جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے

بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا اپنا لیمپ جلا لینا، یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہینگن اور میکو کو پکاروں۔ اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اعتباری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس لئے ایک دن علی الصباح جب گنگو میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گذرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لئے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لئے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں۔ اور بیچ میں جب کوئی کچھ مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ کون دو، دو، چار، چار روپے کا حساب رکھتا پھرے پھر جب کسی کو مہینہ بھر کی مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اُسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے۔ اور شکایتوں سے تو مجھے نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے جبیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو تمھیں بلایا نہیں۔"
گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت، کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے، مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔ "آخر کیا بات ہے؟ کہتے کیوں نہیں۔ تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔"تو آپ ہوا کھانے جائیں۔ میں پھر آجاؤں گا۔"

یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی۔ اس رواداری میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگذشت کہہ سنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ دوسرے موقع پر تو کمبخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو۔ لیکن غور و خوض کو جو میرے لئے انتہائی مصروفیت ہے، وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آکر میرے سر پر سوار ہو جائیگا۔

میں نے تلخی کے ساتھ کہا۔"کیا کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو۔ میں پیشگی نہیں دیتا۔"

"جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔"

"تو کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔"

"جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔"

"تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟"

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گویا کوئی جست لگانے کے لئے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا۔"مجھے اب آپ چھٹی دیدیں۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا۔" یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی۔ میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں، اپنے ملازموں سے کبھی سخت کلامی نہیں کرتا، اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا۔ تحکم کے لہجے میں پوچھا"کیوں کیا شکایت ہے؟"

"آپ نے تو ہجور جیسی نیک طبیعت پائی ہے، ویسی کیا کوئی پائے گا لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ

بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا اپنا لیمپ جلا لینا، یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیگن اور میکو کو پکاروں۔ اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اعتباری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس لئے ایک دن علی الصباح جب گنگو میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گذرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لئے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لئے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں۔ اور بیچ میں جب کوئی کچھ مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ کون دو، دو، چار، چار روپے کا حساب رکھتا پھرے پھر جب کسی کو منہ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اُسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے۔ اور شکایتوں سے تو مجھے نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو تمھیں بلایا نہیں"۔ گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت، کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے، مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا "آخر کیا بات ہے؟ کہتے کیوں نہیں۔ تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے"

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "تو آپ ہوا کھانے جائیں۔ میں پھر آجاؤں گا۔"
یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی۔ اس رواداری میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگذشت کہہ سنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ دوسرے موقع پر تو کمبخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو۔ لیکن غور و خوض کو جو میرے لئے انتہائی مصروفیت ہے، وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آکر میرے سر پر سوار ہوجائیگا۔
میں نے تلخی کے ساتھ کہا۔ "کیا کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو۔ میں پیشگی نہیں دیتا۔"
"جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔"
"تو کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔"
"جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔"
"تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟"
گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گویا کوئی جست لگانے کے لئے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا۔ "مجھے اب آپ چھٹی دیدیں۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کرسکوں گا۔" یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی۔ میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں، اپنے ملازموں سے کبھی سخت کلامی نہیں کرتا، اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا۔ تحکم کے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں کیا شکایت ہے؟"
"آپ نے تو حضور جیسی نیک طبیعت پائی ہے، ویسی کیا کوئی پائے گا لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہوجائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ

کی آبرو میں بٹّہ لگے۔"

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ہوا خوری کا نشہ اُتر گیا۔ توکل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا "تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ کیا معاملہ ہے؟"

گنگو نے مجسّم معذرت بن کر کہا "بات یہ ہے کہ وہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے۔ وہی گومتی دیو ....

وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے بے صبر ہو کر کہا "ہاں نکال دی گئی ہے، تو پھر؟ تمھاری نوکری کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

گنگو نے جیسے اپنے سر کا بھاری بوجھ زمین پر ٹپک دیا۔

"میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ہجور۔"

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ پُرانے خیال کا بوڑھا برہمن جسے نئی تہذیب کی ہوا تک نہیں لگی، اس عورت سے شادی کرے گا جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دے گا۔ گومتی نے محلے کی پرسکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کردی تھی۔ کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کردی، مگر ہر بار وہ ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی۔ یہاں تک کہ آشرم کے سکریٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا۔ وہ اسی محلّے میں ایک کوٹھری لے کر رہتی تھی اور سارے محلّے کے شہدوں کے لئے دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ اس بیوقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جا رہا ہے، جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی تو اس کے پاس کتنے دنوں رہے گی، کوئی گانٹھ

کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ شاید سال چھ مہینے ٹک جاتی۔ یہ تو محض آنکھ کا اندھا ہے۔ ایک ہفتہ بھی تو نباہ نہ ہوگا۔

میں نے تنبیہ آمیز لہجے میں پوچھا۔ "تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟"

گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا۔ "سب جھوٹ ہے سرکار۔ لوگوں نے اس کو ہک ناہک بدنام کیا ہے۔"

"کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟"

"اُن لوگوں نے اُسے نکال دیا تو کیا کرتی؟"

"کیسے احمق آدمی ہو۔ کوئی اتنی دور سے آکر شادی کر کے لے جاتا ہے۔ ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ اس لئے کہ عورت کو نکال دے؟"

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا۔ "جہاں محبت نہیں ہے حجور، وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی ہے۔ کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے ایک بدھوا سے بیاہ کر کے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لئے پہلے آپ اس کا بن جانا پڑتا ہے حجور۔ یہ بات ہے۔ پھر اسے ایک بیماری بھی ہے۔ اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے۔"

"اور تم ایسی عورت سے شادی کرو گے؟" میں نے شبہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "سمجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی۔"

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائیگی آگے بھگوان جی کی مرجی۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "تو تم نے طے کر لیا ہے؟"

"ہاں حجور۔"

"تو میں تمہارا استعفا منظور کرتا ہوں۔"

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں لیکن جو آدمی ایک فاحشہ سے شادی کر لے اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا۔ آئے دن قضئے ہوں گے نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی، کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے۔ کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں۔ گنگو بھو کے آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے۔ روٹی خشک ہے۔ بد مزہ ہے اس کی اسے پروا نہیں۔ اس کا عقلِ سلیم سے کام لینا محال تھا میں نے اس کے علیحدہ کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

(۲)

پانچ مہینے گذر گئے۔ گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اسی محلہ میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا۔ وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گذر بسر کرتا تھا۔ مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا میں اس سے فوراً استفسارِ حال کرتا۔ مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ کی آزمائش تھی۔ معاشرتی ہی نہیں، نفسیاتی بھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں گنگو کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھتا۔ فراغت اور بے فکری سے چہرے پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خودداری پیدا ہو جاتی ہے وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی۔ روپے بیس آنے کی روز بکری ہو جاتی تھی۔ اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس آنے بچ جاتے تھے۔ یہی اس کی معاش تھی۔ مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی، کیونکہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سروسامانی، جو بے غیرتی نظر آتی ہے ان سے وہ پاک تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی جھلک تھی جو سکونِ قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے سُنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمینان اور پُرعافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رُسواکن سانحے، کسی دل فگار اور تباہ کُن تغیر کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح مُنہ دکھاتا ہے۔ اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہوگا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ کتنے نیک نیت تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے۔ گویا نجات کا دروازہ کھُل گیا ہے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں، کتنوں کو دغا دے چکی ہے، تمہارے ساتھ بھی دغا کرے گی، مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اب اس ابلہانہ ضد کا خمیازہ اٹھا اب ملیں تو ذرا مزاج پُرسی کروں۔ کہوں۔ کیوں مہراج، دیوی جی کا یہ بردان پا کر خوش ہوئے یا نہیں۔ تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں۔ اب بتلاؤ کون غلطی پر تھا۔ اب آگیا خیال شریف میں کہ حسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔

اُسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہوگئی۔ بدحواس تھا۔ بالکل کھویا ہوا، اُلم گشتہ، کشتی شکستہ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں، درد سے۔ میرے پاس آکر بولا "بابو جی گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کی"۔

میں نے حاسدانہ مسرت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کر کے کہا "تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا لیکن تم مانتے ہی نہیں۔ اب صبر کرو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ روپے پیسے صاف کر لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟"

گنگو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے

جگر کے ٹکڑے کر دئیے ہیں۔

"ارے بابوجی۔ ایسا نہ کہئے۔ اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی۔ اپنا جو کچھ تھا وہ بھی چھوڑ گئی۔ نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی میں اس کے لائق نہ تھا بس اور کیا کہوں۔ وہ پڑھی لکھی، میں کریا اچھر بھینس برابر۔ میرے ساتھ اتنے دن رہی یہی بہت تھا۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کی آپ سے کہاں تک بکھان کروں بابوجی۔ اوروں کے لئے وہ چاہے جو کچھ رہی ہو، وہ میرے لئے کسی دیوتا کا اشیرباد تھی کیا جانے مجھ سے ایسی کیا کھتا ہو گئی، مگر قسم لے لیجیے جو اس نے بھول کر بھی کبھی شکایت کی ہو۔ میری اوکات ہی کیا ہے بابوجی۔ دس بارہ آنے روز کا مجور ہوں مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔"

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بیوفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کا اظہار کروں گا۔ مگر اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی "تو وہ تمہارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟"

"کچھ نہیں بابوجی۔ دھیلے کی چیز بھی نہیں۔"

"اور تم سے محبت بھی بہت کرتی تھی؟"

"اب آپ سے کیا کہوں بابوجی۔ وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہیگی"

"پھر بھی تمھیں چھوڑ کر چلی گئی؟"

"یہی تو تعجب ہے بابوجی۔"

"تریا چرتر کا نام کبھی سُنا ہے؟"

"ارے بابوجی! ایسا نہ کہئے، میری گردن پر کوئی چھُری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاؤں گا۔"

"تو پھر ڈھونڈھ نکالو۔"

"ہاں مالک! جب تک اُسے ڈھونڈھ نہ لاؤں مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے، پھر تو میں اُسے لے ہی آؤں گا۔ اور بابوجی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے گی ضرور، دیکھ لیجئے گا۔ وہ مجھ سے خفا نہیں تھی۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھانوں گا۔ جیتا رہا تو پھر آپ کے درشن کرونگا۔" یہ کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

(۳)

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا۔ تفریح کے لئے ایک مہینے کے بعد لوٹا اور ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے کھڑا ہے۔ شاید کرشن کو پا کر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہونگے۔ معلوم ہوتا تھا مسرت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ چہرہ اور انکھوں سے تشکر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ کچھ وہی کیفیت تھی جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہو جانے کے بعد نظر آتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ کہو مہراج۔ گومتی دیوی کا کچھ سُراغ ملا۔ تم تو باہر گئے تھے؟

گنگو نے جامے میں پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں بابوجی! آپ کی دعا سے ڈھونڈھ لایا۔ لکھنو کے زنانے ہسپتال میں ملی۔ یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بہت بے قرار ہوں تو بتلا دینا۔ میں سنتے ہی لکھنو بھاگا۔ اور

اور انھیں لے آیا۔ گھاتے میں یہ بچہ بھی مل گیا۔"

اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر میری طرف بڑھایا گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پا کر اسے دکھا رہا ہو۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں پھر بھی یہ بچے کو کتنی بے حیائی سے دکھا رہا ہے۔ میں نے تمسخر کے انداز سے پوچھا "اچھا یہ لڑکا بھی مل گیا۔ شاید اس لئے وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ ہے تو تمہارا ہی لڑکا نہ؟"

"میرا کاہے کو ہے بابوجی، آپ کا ہے۔ بھگوان کا ہے۔"

"تو لکھنؤ میں پیدا ہوا۔"

"ہاں بابوجی۔ ابھی تو کُل ایک مہینے کا ہے۔"

"تمہاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے۔"

"یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے جی۔"

"تو شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا۔"

"اور کیا بابوجی۔"

"پھر بھی تمہارا لڑکا ہے؟"

"ہاں جی۔"

"کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو۔"

معلوم نہیں وہ میرا منشا سمجھ رہا تھا۔ اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا "گھر میں مرتے مرتے بچی بابوجی۔ یہ نیا جنم ہوا۔ تین دن تین رات چھٹ پٹاتی رہی۔ کچھ نہ پوچھئے۔"

میں نے اب کی ذرا طنز کے ساتھ کہا "لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سُنا۔"

یہ کنایہ نشانے پر جا بیٹھا۔ معذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا "مجھے تو بابوجی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی۔ میں نے کہا گومتی اگر تمہارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہو تو تم مجھے چھوڑ دو۔ میں اس دم چلا جاؤں گا اور پھر کبھی تمہارے پاس نہ آؤں گا۔ تمھیں جب کسی چیز کی ضرورت ہو مجھے لکھنا۔ میں بھر سک تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے۔ تم میری نظر میں اب بھی اتنی ہی بھلی ہو۔ اب بھی میں تمہیں اتنا ہی چاہتا ہوں۔ نہیں اب میں تمہیں اور زیادہ چاہتا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ گنگو جیتے جی تم سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ میں نے تم سے اس لئے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو، بلکہ اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ یہ بچہ میرا بچہ ہے۔ میرا اپنا بچہ ہے۔ میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کی پھل کو اس لئے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی دوسرے نے بویا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا۔

میں کپڑے اتارنا بھول گیا۔ کہہ نہیں سکتا کیوں میری آنکھیں پُرآب ہو گئیں نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھا دیا میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لیا اور اس اپنے پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا بھی نہ لیا ہوگا۔

گنگو بولا "بابوجی آپ بڑے شریف ہیں۔ میں گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں۔ کہتا ہوں چل ایک بار ان کے درشن کر آ۔ لیکن مارے شرم کے آتی ہی نہیں۔"

میں اور شریف! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا۔ میں نے عقیدت میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا نہیں جی۔ وہ مجھ جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گی۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں۔ تم مجھے شریف سمجھتے ہو۔ میں ظاہر میں شریف، مگر دل کا کمینہ ہوں۔ اصلی شرافت تم میں ہے اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمہاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔"

میں بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

بدنصیب ماں

(۱)

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا، ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے۔ چار جوان لڑکے اپنی یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی۔ پختہ مکان۔ دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا تو لازمی تھا اور وہ کئی دن تک بے حال رہی لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اُسے تشفی ہوئی چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادتمند۔ چاروں بہوئیں ایک سے ایک فرمانبردار جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پاؤں دباتیں۔ وہ اشنان کر کے اُٹھتی تو اس کی ساڑی دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکا کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس روپے کا نوکر تھا۔ دوسرا اُماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیاناتھ بی۔ اے میں فیل ہو گیا تھا۔ اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا اور امسال بی۔ اے اوّل درجہ میں پاس کر کے ایم اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لااُبالیاں نہ تھیں، نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں۔ جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی، اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنادیا کرتی ہے۔ مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ تک نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارھواں دن تھا۔ کل تیرھویں ہے۔ برھم بھوج ہوگا۔ برادری کی دعوت ہوگی۔ اسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی اپنے

حجرہ میں بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ کہ پیپے دار بوروں میں آٹا لاکر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے ٹین آرہے ہیں۔ سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مٹکیاں سب چلی آرہی ہیں۔ مہابرہمن کے لئے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن، پلنگ، بستر، کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسبِ ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہئے تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی۔ اُسے پسند کرتی۔ اس کی مقدار میں کمی بیشی کرتی۔ تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ اچھا! اور آٹا تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لئے کہا تھا۔ گھی کے بھی پانچ ہی کنستر آئے۔ اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہوگی۔ کس نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ جب اس نے ایک بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملہ میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس نے سو کہا تو سو خرچ کئے گئے۔ ایک کہا تو ایک۔ کسی نے مین میکھ نہ کی۔ یہاں تک کہ پنڈت اجودھیا ناتھ سب کچھ اسی کی مرضی پہ چھوڑ دیتے تھے۔ پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے فیصلہ کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ وہ اسے کیونکر برداشت کر سکتی ہے۔

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کئے بیٹھی رہی، پر آخر اس سے نہ رہا گیا۔ خود مختاری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔ غصہ میں بھری ہوئی آئی اور کامتا ناتھ سے بولی "کیا آٹا تین بورے لائے۔ میں نے تو پانچ بوروں کے لئے کہا تھا۔ اور گھی بھی پانچ کنستر تمہیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔ کفایت کو میں بُرا نہیں کہتی، لیکن جس نے یہ کنواں کھودا اُسی کی آتما پانی کو ترسے یہ کتنے شرم کی بات ہے۔"

کامتا ناتھ نے معذرت نہیں کی۔ عذر گناہ نہیں کیا۔ نادم بھی نہیں ہوا، فوراً

تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا۔ پھر بولا۔
"ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوروں کی ہوئی۔ اور تین بوروں کے لئے پانچ کنستر
گھی کافی تھا۔ اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کر دی گئیں"

پھول متی تیز ہو کر بولی "کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟"

"ہم لوگوں کی رائے سے۔"

"تو میری رائے کوئی چیز نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم بھی سمجھتے ہیں"

پھول متی ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس جملہ کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اپنا نفع نقصان یہ "اپنا" کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس گھر کے نفع نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ دوسروں کو، خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لونڈا تو اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اُس کا ہے۔ اُس نے مر مر کر یہ گرہستی جمع کی ہے۔ میں تو غیر ہوں۔ ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو، مجھے اختیار ہے، میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں۔ ابھی جاکر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ۔ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔"

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہ کر دی تھی۔ اور اب وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرہ میں چلی آئی، حالانکہ کامتا ناتھ بھی وہیں کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے سے ایسا مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے۔ مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔ اتنی تنبیہ پر بھی کسی کو اسکی نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے، یہ اُس کے ذہن میں نہ آیا مگر رفتہ رفتہ اس پر اب

حقیقت کھلنے لگی کہ اس گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں سے لونڈیں گھی، شکر، مٹھائی وغیرہ آرہی تھی بڑی بہو ان چیزوں کو خود خاص انداز سے سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہوئیں بھی بھنڈارے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے کچھ پوچھتے نہیں آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتا ناتھ سے! یا بڑی بہو سے کامتا ناتھ کہاں کا بڑا اہتمم ہے۔ دن بھر بھنگ پیئے پڑا رہتا ہے۔ اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہوگی اور کیا۔ سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہوجائے گی تب ادھر اُدھر بھاگے بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لئے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہئے۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتّل پر پہنچے گی کسی پر نہیں۔ آخر ان سبھوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اچھا! بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے۔ کنجی اس کے پاس ہے ضرور، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی۔ آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جاکر تند لہجہ میں کہا۔ سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا۔

بڑی بہو نے۔ بے باکانہ انداز سے کہا "بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیا جائے گا"۔ کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے مجھے کچھ معلوم نہیں جب تک حساب کتاب نہ ہو جائے روپے کیسے دئے جائیں؟"

"حساب کتاب سب ہو گیا ہے"!

"کس نے کیا؟"

"اب میں کیا جانوں جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو"

پھول متی پھر آکر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی تو کہیں گے کہ پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے۔ جب مہمان رخصت ہو جائیں گے تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھے گی اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ کاریردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ بارہ بجتے بجتے دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یکبارگی کھانے کے لئے بلائے گئے۔ پھول متی کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی۔ دو پنگتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا۔ یہی تو ہوتا کہ دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی۔ مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتہً شور مچا "ترکاریوں میں نمک نہیں"۔

بڑی ہو جلدی جلدی نمک پیسنے گئی۔ پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ مگر اس موقعہ پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ بارے نمک پیسا اور پتیلوں میں ڈالا گیا۔

یکایک پھر شور مچا "پانی گرم ہے"۔

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑایا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں۔ آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی۔ ایسی بدانتظامی اس کے گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی

کسی کو بھی سُدھ نہیں رہی، سُدھ کہاں سے آئے، جب کسی کو گپ مارنے سے فرصت ملے۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برتن تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں ہلچل مچی؟ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری چوہیا نکل آئی۔ یا بھگوان! اب تمہیں آبرو قائم رکھیو جی! اس پھوہڑپن کی بھی کوئی حد ہے۔ سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں۔ نہ اُٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلیگا۔ پھول متی کے دل میں ایسا اُبال اُٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا لے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اٹھ چکے تھے۔ پتّلوں پر کھانا جوں کا توں پڑا ہوا تھا چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھی اسی وقت پھول متی شعلہ کی طرح لپک کر آئی اور بولی۔ منہ میں کالکھ لگ گئی، کہ نہیں؟ یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلّو بھر پانی میں۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ ہفتوں اس دعوت کا چرچہ رہے گا۔ مذاق اُڑایا جائے گا۔ تم لوگوں کو کچھ شرم حیا تو ہے نہیں تمہیں کیا۔ آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا

کامتا ناتھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر بولا "اچھا اب رہنے دو اماں غلطی ہوئی۔ ہم سب مانتے ہیں۔ بہت بڑی غلطی ہوئی لیکن کیا اب اس کے لئے آدمیوں کو حلال کر ڈالوگی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کرتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔

بڑی بہو نے فرمایا "ہم کیا جانتے تھے کہ بیبی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہوگا چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہوگی۔ انھوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاؤ میں ڈال دیا

کامتا ناتھ نے بیوی کو ڈانٹا "اس میں نہ کملا کا قصور ہے نہ تمہارا، نہ میرا۔ اتفاق ہے۔ اتنے بڑے بھوج میں ایک ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دئیے جاتے ہیں اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی ناک کٹائی۔ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو"

پھول متی "شرماتے تو نہیں۔ الٹے اور بے حیائی کی باتیں کرتے ہو"

کامتا "شرماؤں کیوں۔ کسی کی چوری کی ہے چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن، یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے کسی کو خبر تک نہ ہوتی"

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی "کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا"

کامتا ناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا "کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں۔ اب ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھرماتما لوگ جو تیل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں، ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہو۔ تالاب کے کچھوے اور گھونگھے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا اُن سب سے ناپاک ہے"

پھول متی کے پاس ایسی کٹھ حجتوں کا جواب نہ تھا۔ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

(۲)

دو مہینے گذر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتا ناتھ نے مسند پر ٹیک کر کہا "میں تو کمد کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں"

امانا تھ "تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے پڑ تے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لئے کم سے کم پانچہزار کی ضرورت ہے۔"

ویانا تھ "مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچہزار اپنے ہونگے تو پانچہزار کا کوئی ساجھی دار مل جائے گا۔ میں تو اپنے روپے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔"

کامتا "دادا نے پانچہزار جہیز ٹھہرایا تھا، اس کی ضرورت ہی کیا ہے' کریں تو مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی آرام سے رہ سکتی ہے۔ بدنصیب ہو تو راجہ کے گھر میں بھی روتی رہے گی۔ یہ تو نصیبوں کا کھیل ہے۔"

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا "یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا جائے کہ پانچہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب روپے دیدونگا۔"

کامتا ناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا "سنتے ہو اس کی باتیں۔"

اُما "جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔"

کامتا "تم اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمہاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

سیتا "جی ہاں۔ یاد ہے۔"

اُما۔ "اور جو کہیں تمہیں ولایت جاکر پڑھنے کے لئے کل وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لئے روپیہ کہاں سے لاؤ گے؟ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے۔"

کامتا "اور وظیفہ تمہیں ملے گا۔ کہو میں آج لکھدوں۔"

اس دلیل نے سبتا ماتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقعہ اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار روپے تیاریوں کے لئے درکار ہوں گے۔ کُمد کے لئے وہ اپنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کر دے۔

بولا "ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی بھی ضرورت پڑے گی"

کامتا "تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کُمد کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم۔ اے۔ بی۔ اے نہ سہی۔ جمانی سے اُن کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے"

اُما "ہاں جہیز کا کوئی سوال نہیں ہے تیسری شادی ہے"

کامتا "یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح رہی کہ مراری لال کو جواب دیدیا جائے اور دین دیال کے ساتھ سگائی طے کی جائے"

دیا "اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیئے"

کامتا "اماں سے پوچھنا بیکار ہے۔ اُن کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے وہی پرانے وقتوں کی باتیں۔ مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا"

اُما "وہ مانیں گی نہیں۔ اپنے زیور بیچ کر کُمد کی شادی کریں گی۔ دیکھ لینا"

کامتا "ہاں یہ ممکن ہے۔ زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے۔ یہ اُن کا

استری دھن ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں۔"

دیاناتھ "استری دھن ہے تو کیا اُسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے۔"

کامتا "کسی کی کمائی ہو۔ استری دھن عورت کی چیز ہے۔"

اُما "یہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں۔ استری دھن کوئی چیز نہیں۔ گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ ابھی دینیدیال کا کچھ ذکر نہ کرو ورنہ وہ اُڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آ جائیں تو صاف صاف کہہ دو۔ تب کیا کر لیں گی۔"

دیا "ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔"

کامتا "مجھے تو دھوکے کی چال مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ جس چیز پر ہمارا حق ہے اس کے لئے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لئے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔"

دیاناتھ "تو آپ الگ بیٹھئے۔ میں جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا۔ اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجئے گا۔"

کامتا "نا بھیا میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔"

سیتا "میرا بھی استعفیٰ ہے۔"

اُما "ان لوگوں کو جانے دو جی۔ ہم اور تم مل کر رنگ جما لیں گے۔ یہ دھرماتما لوگ ہیں۔ بھیا نوکر ہی ہیں۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہی ہے۔ ضرورت تو ہمیں

اور تمھیں ہے"۔

بڑی بہو نے فرمایا "پچاس روپے گئے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔ اتنے دن مجھے آئے ہو گئے پیتل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا۔ توفیق ہی نہ ہوئی۔ آج دھرما تما بنے ہیں"۔

اُما "اماں کے زیور مل جائیں گے تو اُن کا ہار تمھیں دیدوں گا بھابھی خاطر جمع رکھو"

بڑی بہو "مل چکے۔ وہ گُڑ نہیں جو چینٹے کھائیں"۔

دیا "اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لے کر نہ آؤں تو مُنہ نہ دکھاؤں"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیا ناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا ممتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہو گئی۔ اُس پر اُما ناتھ نے اور بھی رنگ جمایا۔ اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے تو ابھی مل نہیں سکتے۔ مہینوں خط و کتابت ہو گی۔ تحقیقات ہو گی۔ وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا تب کہیں جا کر روپے ملیں گے پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیا ناتھ کو دیدیئے۔ اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(۴)

دو تین مہینے اور گذر گئے۔ زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے تھے۔ اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دُکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے چاروں کرتے اپنے دل کی، لیکن ماں سے صلاح لے لیتے، یا ایسا جال پھیلاتے

کہ وہ ان کی باتوں میں آجاتی' اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گذرتا تھا لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اُسے بیع کرنے پر راضی ہو گئی۔ ہاں کمد کی شادی کے معاملہ میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری کے لڑکے سے ہی ہوگی چاروں بھائی پنڈت دیندیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آ گئی۔

پھول متی نے کہا "ہاں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے؟ تمہیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔ پچیس ہزار کا مکان بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کمد کا حصہ نہیں ہے؟"

کامتا ناتھ نے نرمی سے کہا "اماں کمد ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو۔ لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کمد کا حصہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار سے ہو جائے اسکے لئے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے"۔

اُما ناتھ نے تصحیح کی "پانچ ہزار کیوں صاحب' دس ہزار کہئے۔ دعوت۔ ضیافت۔ رسم رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہونگے"۔

کامتا "ہاں ٹھیک ہے۔ دس ہزار ہی سمجھو۔ دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے"۔

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا "شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں چاہے دس ہزار۔ میرے شوہر کی کمائی ہے میں نے مر مر کر جوڑا ہے۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی۔ تم سے مانگنے جاؤں

تو مت دینا۔"

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا۔ بولے "اماں، تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمہارا نہیں ہے وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے کچھ خرچ نہیں کر سکتیں۔"

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ بولی "کیا کہا۔ پھر تو کہنا۔ میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی۔"

کامتا "وہ روپے تمہارے نہیں ہمارے ہیں۔"

پھول متی "تمہارے ہونگے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد۔"

کامتا "نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا۔"

اُما "اماں قانون تو جانتی نہیں، خواہ مخواہ الجھتی ہیں۔"

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلہ کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ لال ہو گیا۔ بولی "تمہارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمہارے دادا ایسے کوئی دھنّا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کئے ہیں۔ نہیں تو آج اس گھر میں دھول اڑتی ہوتی۔ گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے۔ میں نے تم چاروں بھائیوں کی شادی میں دس دس ہزار خرچ کئے ہیں۔ تمہاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہونگے۔ کمد بھی تو میرے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا وہ تم لے لینا"

اُما ناتھ نے جھلا کر کہا "بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں

جا کر مراری لال کو خط لکھ دیجئے۔ تمھارے ہاں شادی نہ ہوگی۔ دین دیال کے پاس آج ہی پیغام بھیجدیجئے۔ اماں کو بکنے دیجئے۔ یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں۔ بیکار بحث کرتی ہیں۔"

پھول متی نے ضبط کر کے کہا "اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں"۔

اما "قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گذارہ لینے کا ہے"۔

پھول متی نے پوچھا "کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟"

اما "ہمارے رشیوں نے۔ مہاراج منو نے۔ اور کس نے"۔

پھول متی ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی "تو میں اس گھر میں تمہارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں؟"

اما "تم جیسا سمجھو"۔

پھول متی "گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے۔ باغ میں نے خریدا۔ اور آج اس گھر میں میں غیر ہوں۔ منو نے یہی قانون بنایا ہے۔ اچھی بات ہے۔ اپنا گھر بار لو۔ میری جان چھوڑو۔ اس طرح تمہاری محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ مر جاؤں۔ واہ رے اندھیر! میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتہ نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائداد اپنے نام کرا لیتی"۔

چاروں نوجوانوں پر ماں کی اس تندی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی۔ دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے

پتوں میں بھی حس نہ تھا۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں، پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

(۴)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائینگے اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اس نے خون جگر پلا پلا کر پالا، جن پر اسے اتنا غرور تھا وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی۔ اب اس گھر میں رہنا اسے عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے، یہ اس کی خوددار طبیعت کے لئے حد درجہ گراں تھا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا، اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا' بدنامی تو اسی کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہوئی مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے جنہیں اس نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس بیکسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے کو ایک نئے طرز عمل کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اسے اب نئے ماحول کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن بن کر رہی اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے۔ اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلہ میں پھر بھی غنیمت ہیں وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپے اپنی اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات

بی...جانی کونت میں گذر گئی۔
جاڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی معمول کے خلاف آج تڑکے ہی اُٹھی۔ رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اُس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے تب تک اسے بہت سویرے نہ اُٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈ اسے بہت مضر تھی۔ مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چُننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے، بہوئیں اُٹھیں۔ سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سُکڑے ہوئے کام کرتے دیکھا پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔
آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا سارے گھر کی خدمت کرنا، اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خودداری کی جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرتناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جہاں بجلی جلتی تھی وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا جس کے بجھانے کے لئے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔
بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کُمد کی شادی طے ہو گئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے۔ لیکن روٹی دال سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرارداد کے شادی منظور کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوئی۔ کُمد رخصت ہو گئی۔ پھول متی کے دل

کیا گذر رہی تھی۔ اسے کون جان سکتا ہے۔ کُمد کے دل پر کیا گذر رہی تھی اُسے بھی کون جان سکتا ہے۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا اُن کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا آرام کرے گی تکلیف لکھی ہوگی تکلیف اٹھائے گی گھر والوں نے جس سے شادی کر دی اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک۔ انحراف اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کُمد کو کیا دیا گیا، مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی گئی، کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا، اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو، مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔

جب کُمد کے لئے دروازے پر ڈولی آگئی اور کُمد ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اُسے اپنی کوٹھری میں لے گئی اور جو کچھ سو پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے بیٹی کے آنچل میں ڈال کر روتی ہوئی بولی "بیٹی میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ نہیں آج کیا تمہاری شادی اس طرح ہوتی اور تم اس طرح بدا کی جاتیں"۔

کُمد نے زیور اور روپے آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں پر رکھ دئے اور بولی "اماں میرے لئے تمہاری آشیرباد لاکھوں روپیوں کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو۔ نہیں معلوم ابھی تمہیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے" پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُمانا تھ نے آکر کہا "کیا کر رہی ہو۔ کُمد چل جلدی کر۔ ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں۔ پھر تو وہ چار مہینے میں آئے گی ہی۔ جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا" پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا "میرے پاس اب کیا ہے بیٹا جو میں اسے دوں گی۔ جاؤ بیٹی۔ بھگوان تمہارا سہاگ امر کریں"۔

کمد رخصت ہوگئی۔ پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(۵)

ایک سال گذر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اُس نے اُسے بڑی بہو کے لئے خالی کر دیا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی تھی، جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اُسے اب کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی۔ گھر کے کسی فرد سے، کسی معاملہ سے اُسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لئے تھی کہ اُسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی یا رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اُما ناتھ کا مطب کھلا۔ احباب کی دعوت ہوئی۔ دیا ناتھ نے اخبار جاری کیا۔ پھر جلسہ ہوا۔ سیتا ناتھ کو وظیفہ ملا۔ وہ ولایت پڑھنے گیا۔ پھر جشن ہوا۔ کامتا ناتھ کے بڑے لڑکے کا یگیوپویت ہوا۔ خوب دھوم دھام ہوئی۔ پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ اُما ناتھ "ٹائیفائڈ" میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیا ناتھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ ۱۲۴ الف میں چھ مہینے کے لئے جیل چلے گئے۔ اُما ناتھ نے ایک معاملہ میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لئے معطل کر دئے گئے۔ پر پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیں تک نہ پڑی۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا۔ یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے، مگر کھاتا ہے دل سے۔ وہ بے کہے کام کرتی تھی۔ مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے۔ کچھ پروا نہیں۔ اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل تھے، زمین پر مٹیالا پانی۔ نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ بھیگ کر

سارا کام کیا۔ آگ جلائی۔ پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتا ناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔ نل کا پانی انھیں موافق نہ تھا۔

کامتا ناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا "رہنے دو اماں میں پانی بھر لاؤں گا۔ کہار اور مہری آج دونوں غائب"

پھول متی ... شبے سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "تم بھیگ جاؤ گے بیٹا۔ سردی ہو جائے گی۔"

"تم بھی بھیگ رہی ہو۔ کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ"

"میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے"

اُما ناتھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مطلب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا۔ اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ بولا "جانے بھی دو بھیا۔ بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے۔ اسکا خمیازہ اٹھانے دو"

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے۔ افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ پاؤں پھسلا سنبھل نہ سکی۔ پانی میں گر پڑی پل بھر ہاتھ پاؤں چلائے پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار پنڈے چلائے۔ ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔ دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں جنہیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا تھا۔ ایک نے پوچھا "یہ کون بڑھیا تھی؟"

"ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے"

"اجودھیا ناتھ تو بہت بڑے آدمی تھے"

"ہاں، اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا"

۵۱

"اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں!"
"ہاں سب ہیں بھائی۔ مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے!"

شانتی

مرحوم دیوناتھ میرے دوستوں میں تھے آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے تو وہ رنگ رلیاں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور کہیں تنہائی میں جاکر ذرا دیر رولیتا ہوں۔ میرے اور اُن کے درمیان دو ڈھائی سومیل کا فاصلہ تھا۔ میں لکھنؤ میں تھا وہ دہلی میں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا کہ ہم آپس میں نہ مل لیتے ہوں۔ وہ نہایت شریف محبت نواز اور دوستوں پر جان دینے والے آدمی تھے جنہوں نے اپنے اور پرائے میں بھی امتیاز نہیں کیا۔ دنیا کیا ہے۔ اور یہاں شرافت و محبت کا صلہ کیا ملتا ہے، یہ انھوں نے کبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ اُن کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب اُنھیں آئندہ کے لئے ہوشیار ہو جانا چاہئے تھا۔ دوستوں نے اُن کی صاف دلی سے نامناسب فائدہ اٹھایا اور کئی مرتبہ انھیں شرمندہ بھی ہونا پڑا لیکن اس بھلے آدمی نے زندگی سے سبق لینے کی قسم کھالی تھی۔ اُن کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جیسے بھولا ناتھ جئے ویسے ہی بھولا ناتھ مرے۔ جس دنیا میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی۔ جس میں بدگمانی و چالاکی اور بغض و حسد کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ سب اپنے تھے کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے بار بار انھیں متنبہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کا نتیجہ امید کے خلاف برآمد ہوا۔ زندگی کے خوابوں کو پریشان کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا۔ مجھے کبھی فکر ہوتی تھی، کہ انھوں نے ہاتھ بند نہ کیا تو نتیجہ کیا ہوگا؟ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گویا بھی کچھ انہی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو ایک تال اندیشی ہوتی ہے اور جو ایسے اڑاؤ مردوں کی غیر مآل اندیشیوں کے لئے بینک کا کام کرتی ہے۔

اس سے گویا محروم تھی۔ یہاں تک کہ اسے کپڑوں اور زیوروں کا بھی شوق نہ تھا۔ جب مجھے دیوناتھ کے انتقال کی خبر ملی اور میں بھاگا ہوا دلی گیا تو گھر میں برتن بھانڈے کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا۔ ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی جو زیادہ فکر کرتے۔ پورے چالیس کے بھی تو نہ ہوئے تھے۔ یوں تو لاپرواہی ان کی سرشت میں داخل تھا لیکن اس عمر میں سبھی لوگ بے فکر ہوتے ہیں۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد دو لڑکے ہوئے۔ دونوں لڑکے تو بچپن ہی میں داغ دے گئے۔ لڑکی بچ رہی تھی۔

جس طرزِ معاشرت کے وہ عادی تھے اُسے دیکھتے ہوئے اس مختصر کنبے کے لئے دو سو روپے ماہوار کی ضرورت تھی۔ دو تین سال میں لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہوگا۔ کیسے کیا ہوگا۔ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔

اس موقع پر مجھے یہ بیش قیمت تجربہ ہوا کہ جو لوگ خدمتِ خلق کرتے ہیں اور ذاتی مفاد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے اُن کے پسماندوں کو آسرا دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے، کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنھوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کئے لیکن ان کے بعد ان کے بال بچوں کی کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ ہو دیوناتھ کے دوستوں نے شرافت سے کام لیا اور گویا کی بسر اوقات کے لئے روپیہ جمع کرنے کی تجویز کی۔ ایک صاحب جو رنڈوے تھے اس سے بیاہ کرنے کو بھی تیار تھے۔ لیکن گویا نے بھی اسی جذبہ کا اظہار کیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے اور اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ مکان بہت بڑا تھا۔ اس کا ایک حصہ کرایہ پر اٹھا دیا۔ اس طرح اس کو پچاس روپیہ ماہوار ملنے لگے۔ وہ اتنے ہی میں اپنا نباہ کر لے گی۔ جو کچھ خرچ تھا وہ شنّی کی ذات سے تھا۔

اس کے ایک ہی مہینہ بعد مجھے کاروبار کے سلسلہ میں غیر ممالک جانا پڑا۔ اور وہاں میرے اندازے سے کہیں زیادہ، دو سال لگ گئے۔ گوپا کے خطوط برابر جاتے رہتے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ہے کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے مجھے بھی غیر سمجھا اور صحیح حالت چھپائی رہی۔

پردیس سے لوٹ کر میں سیدھا دہلی پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے رونا آگیا۔ موت کی افسردگی سی طاری تھی جس کمرے میں دوستوں کے جمگھٹ رہتے تھے، اس کے دروازے بند تھے۔ مکڑیوں نے چاروں طرف جالے تان رکھے تھے۔ پہلی نظر میں تو ایسا شبہ ہوا کہ دیوناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں توہم پرست نہیں ہوں اور اجسام روحانی کا بھی قائل نہیں لیکن اس وقت میں ایک بار چونک ضرور پڑا۔ دل میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی لیکن دوسری نظر میں یہ خیالی تصویر مٹ چلی تھی۔ دروازہ کھلا۔ گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا؟

میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع تھی اور اس نے میرے استقبال کے لیے نئی ساری پہن لی تھی، اور شاید بال بھی گوندھ لئے تھے۔ پر ان دو برسوں میں وقت نے اس پر جو مظالم کئے تھے انھیں وہ کیا کرتی؟ عورتوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہے جب حسن و شباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ جب اس میں الھڑپن، شرم اور بے اعتنائی کی جگہ لگاوٹ، خوش ادائی اور دلآویزی آجاتی ہے، لیکن گوپا کی جوانی ختم ہو چکی تھی۔ اسکے چہرے پر جھریاں تھیں، بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم بیمار تھیں، گوپا؟"

اُس نے آنسو پی کر کہا: "نہیں تو۔ میرے تو کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا۔"

"تو تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ بالکل بوڑھی ہو گئیں۔"

"تو اب جوانی لے کر کرنا ہی کیا ہے۔ میری عمر بھی تو بتیس ۳۲ سے اوپر ہو گئی۔"

"یہ عمر تو زیادہ نہیں ہوتی۔"

"ہاں اُن کے لئے جو بہت دن جینا چاہتے ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنّتی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے چھٹی پا جاؤں۔ پھر مجھے زندگی کی پروا نہ رہے گی۔"

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس مکان میں کرایہ دار تھے وہ تھوڑے دنوں کے بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور تب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چبھ گئی۔ اتنے دنوں ان بیچاروں نے کس طرح بسر کی۔ یہ خیال ہی دردناک تھا۔

میں نے متاسف ہو کر کہا: "لیکن تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ کیا میں بالکل غیر ہوں؟"

گوپا نے شرمندہ ہو کر کہا: "نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ تمہیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی؟ میں نے سوچا پردیس میں تم خود اپنے جھمیلے میں پڑے ہو گے تمھیں کیا ستاؤں۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ ہی گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا۔ تو تھوڑے سے گہنے تھے ہی۔ اب سنتا کے بیاہ کی فکر ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مکان کو الگ کر دوں گی بیس بائیس ہزار روپے مل جائیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے اور سود ملا کر اس پر بیس ہزار ہو گئے ہیں۔ مہاجن نے اتنی ہی دیا کیا کم کی کہ مجھے گھر سے نکال نہیں دیا۔ ادھر سے تو اب کوئی امید نہیں۔ بہت ہاتھ پاؤں

۱۲۴۰۹

جوڑ نے پرشاید مہاجن سے دو ڈھائی ہزار روپیہ اور مل جائیں۔ اتنے میں۔
کیا ہوگا؟ اسی فکر میں گھلی جارہی ہوں۔ لیکن میں بھی کیسی مطلبی ہوں۔ نہ تمھیں
ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا نہ کچھ ناشتے کو لائی" اور اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔ اب
آپ کپڑے اتاریئے اور آرام سے بیٹھئے۔ کچھ کھانے کو لاؤں کھا لیجئے، تب
باتیں ہوں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے"؟

میں نے کہا" میں تو بمبئی سے سیدھا یہاں آرہا ہوں، گھر کہاں گیا"؟

گوپا نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ اُسوقت اس کی نگاہوں میں شباب
کی جھلک تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کی جھرّیاں مٹ گئی ہیں۔
چہرے پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی ہے۔ اس نے کہا" اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری
دیوی جی تمھیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی"۔

"میں کسی کا غلام ہوں"؟

کیسی کو اپنا غلام بنانے کے لئے پہلے خود بھی اسکا غلام بننا پڑتا ہے"
شام ہورہی تھی۔ سُنیتا لالٹین لے کر کمرے میں آئی۔ دو سال پیشتر کی معصوم
لڑکی اب منزل شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کرتا تھا اسکی
طرف آج آنکھیں نہ اٹھا سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج
میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے۔ اور
جیسے میں اسے اس چیز کے چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا" سُنّی اب تم کس درجہ میں پڑھتی ہو"؟

اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا" دسویں میں ہوں"۔

"گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو"؟

"ہاں جب کرنے بھی دیں"۔

گوپا نے کہا "میں نہیں کرنے دیتی یا تو خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی"۔ سُنیتا منہ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دُلاری لڑکی تھی جس دن وہ گرہستی کا کام کرتی اُس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی۔ مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔ یہ شکایت بھی اس کے پیار ہی کا ایک کرشمہ تھی۔

میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے پھر سُنیتا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے ہیں لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقع کیوں ملے۔ کہ دادا ہوتے تو شاید میرے لئے اس سے اچھا بر ڈھونڈتے۔ پھر گوپا نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔

میں نے متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے انجینیر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپیہ جمع کر لئے تھے۔ پر اب تک اُن کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا جہاں اسکی رسائی دشوار تھی۔

میں نے کہا "مداری لال تو بہت ہی بُرا آدمی ہے"۔

گوپا نے دانت تلے زبان دبا کر کہا "ارے نہیں بھیا۔ تم نے انھیں پہچانا نہ ہوگا۔ میرے اوپر بڑے دیالو ہیں۔ کبھی کبھی آکر خیریت بھی پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا ہونہار ہے کہ میں تم سے کیا کہوں۔ پھر اُن کے یہاں کمی کس بات کی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے وہ خوب رشوت لیتے تھے۔ لیکن یہاں دھرماتما کونسا ہے؟ کون موقع پا کر چھوڑ دیتا ہے۔ مداری لال نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ مجھ سے جہیز نہیں چاہتے صرف لڑکی چاہتے ہیں۔ سُنیتی اُن کے من میں بیٹھ گئی ہے"۔

مجھے گوپا کی سادگی پر رحم آیا۔لیکن میں نے سوچا کہ میں اس کے دل میں کسی کے خلاف شُبہات کیوں پیدا کروں۔ شاید مداری لال اب وہ نہ رہے ہوں۔انسان کی طبیعت بدلتی رہتی ہے۔

میں نے نیم متفق ہو کر کہا۔"مگر یہ تو سوچو۔تم میں اور ان میں کسقدر فرق ہے۔تم شاید اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی اُن کا مُنہ سیدھا نہ کر سکو۔"

لیکن گوپا کے من میں بات جم گئی تھی۔سنّی کو وہ ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

دوسرے دن میں مداری لال کے پاس گیا اور اُن سے میری جو بات چیت ہوئی اُس نے مجھے مطمئن کر دیا۔کسی زمانہ میں وہ لالچی رہے ہونگے لیکن اسوقت تو انھیں بہت ہی بلند خیال اور پاک دل پایا۔

بولے "بھائی صاحب میں دیونا تھجی سے خوب واقف ہوں۔وہ آدمیوں میں رتن تھے۔اُن کی لڑکی میرے گھر میں آئے۔یہ میری خوش قسمتی ہے۔آپ اس کی ماں سے کہہ دیجئے مداری لال ان سے کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔خدا کا دیا ہوا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔میں انھیں زیر بار کرنا نہیں چاہتا۔"

میرے دل کا بوجھ اُتر گیا۔ہم سُنی سُنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کیسے غلط خیالات قایم کر لیتے ہیں۔میں نے آکر گوپا کو مبارکباد دی یہ طے ہوا کہ گرمیوں میں بیاہ کر دیا جائے۔

یہ چار مہینے گوپا نے بیاہ کی تیاریوں میں کاٹے۔میں مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اس سے مل جاتا تھا۔لیکن ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹتا۔گوپا نے

اپنے خاندان کی عزت کا نہ جانے کتنا بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ دیوانی اس بھرم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی یہ اُولو العزمی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائیگی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں۔ اور آئے دن بھلا دئیے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ کہلانا چاہتی تھی کہ اس گئی گذری حالت میں بھی لُٹا ہُوا ہاتھی نو لاکھ کا ہے۔ قدم قدم پر اُسے دیوناتھ کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام یوں نہ ہوتا یوں ہوتا۔ اور تب وہ روتی۔ مداری لال نیک آدمی ہے، سچ ہے لیکن گوپا کا اپنی بیٹی کے متعلق بھی تو کچھ فرض ہے۔ اس کے دس پانچ لڑکیاں تھوڑی ہیں۔ وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔ سُنتیا کے لئے اس نے جتنے گہنے اور جوڑے بنوائے تھے انھیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی سُناروں کی دوکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی مہمانوں کی مدارات کا انتظام کر رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے اس نے کچھ قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی۔ پر دینے والے دان سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلہ اسکا مددگار تھا۔ سنتیا اب محلہ کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزت سب کی عزت ہے اور گوپا کے لئے تو نیند اور آرام حرام تھا۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے آدھی رات ہوگئی ہے مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان۔ کیا کیا کرے؟ جو کام دوسروں پر چھوڑ دیتی ہے اُسی میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو جاتی ہے، لیکن اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں مانتی۔

پچھلی مرتبہ اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ بولا "گوپا دیوی۔ اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرنا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اسکے پہلے ہی کہیں چل دو۔"

گوپا نے جواب دیا۔ "بھیا۔ اس کی فکر نہ کرو۔ بیوہ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ تم نے سُنا نہیں، رانڈ مرے نہ کھنڈر ڈھئے۔ لیکن میری تمنا یہی ہے کہ سُنّی کا ٹھکانا لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب اور زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سوچو کیا کروں۔ اگر کسی طرح کا رخنہ پڑ گیا تو کس کی بدنامی ہوگی؟ ان چار مہینوں میں مشکل سے گھنٹہ بھر سوتی ہونگی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ لیکن میرا دل خوش ہے۔ میں مروں یا جیوں، مجھے تسکین تو ہوگی کہ سُنیتا کے لیے اس کا باپ جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے اپنی شرافت دکھائی، تو مجھے تو اپنی ناک رکھنی ہے۔"

ایک دیوی نے آکر کہا۔ "بہن۔ ذرا چل کر دیکھ لو۔ چاشنی ٹھیک ہو گئی ہے یا نہیں۔" گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا امتحان کرنے گئی۔ اور ایک لمحہ کے بعد آکر بولی۔ "جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی۔ ادھر چاشنی اتنی کڑی ہو گئی کہ لڈو دانتوں سے لڑیں گے۔ کسی سے کیا کہوں؟"

میں نے چڑھ کر کہا۔ "تم بیکار کا جھنجھٹ کر رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں؟ پھر تمہارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے جن کے لئے یہ طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ کی مٹھائی ان کے لئے بہت ہوگی"

میری یہ بات شاید گوپا کو ناگوار ہوئی۔ ان دنوں اسے بات بات پر غصہ آجاتا تھا بولی۔ "بھیا تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمہیں نہ ماں بننے کا موقع ملا نہ بیوی بننے کا۔ سُنیتا کے باپ کا کتنا نام تھا۔ کتنے آدمی اُن کے دم سے پلتے تھے۔ کیا یہ تم نہیں جانتے، یہ پگڑی میرے ہی سر تو بندھی ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے گا۔ ناستک ہو جو ٹھہرے۔ پر میں تو انہیں سدا اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہ کر رہے ہیں۔ میں ناقص العقل بھلا اکیلی کیا کر لیتی؟ وہی میرے مددگار ہیں، وہی میرے رہبر ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ جسم میرا ہے لیکن اس کے اندر جو آتما

وہ ان کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو تم نے اپنے سینکڑوں روپے خرچ کئے اور اتنے حیران ہو رہے ہو۔ میں تو ان کی شریک زندگی ہوں، لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی۔"

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جون میں شادی ہو گئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا۔ لیکن پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اگر آج سُنیتا کے باپ ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے، برابر روتی رہی۔

جاڑوں میں میں پھر دہلی گیا۔ میرا خیال تھا کہ گوپا اب خوش ہو گی۔ لڑکی کا گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔ گوپا کو اس کے سوا اور کیا چاہئے۔ لیکن سُکھ اُس کے مقدر ہی میں نہ تھا۔

میں ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ اس نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا۔ "بھیا! گھر دوار سب کچھ اچھا ہے۔ ساس سسر بھی اچھے ہیں لیکن داماد نکما نکلا۔ سُنّی بیچاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے۔ تم اُسے دیکھو تو پہچان نہ سکو بس اسکا سایہ ہی رہ گیا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر چھاتی پھٹتی تھی۔ نہ تن بدن کی سدھ ہے نہ کپڑے لتے کی۔ میری سُنیتا کی یہ دُرگت ہو گی۔ یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ بالکل گُم سُم ہو گئی ہے کتنا پوچھا۔ بیٹا! تجھ سے وہ کیوں نہیں بولتا۔ بس آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ میری سُنّی تو کنوئیں میں گر گئی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے اس کے گھر والوں سے پتہ نہیں لگایا؟"

"لگایا کیوں نہیں بھیا۔ سب حال معلوم ہو گیا۔ لڑکا چاہتا ہے کہ میں چاہے جس راہ جاؤں سُنّی میری پوجا کرتی رہے۔ سُنّی بھلا اسے کیوں سہنے لگی

اسے تم جانتے ہو کہ کتنی خوددار ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ پیار دُلار پایا ہے۔ باپ بھی اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی آنکھ کی پُتلی سمجھتی تھی۔ شوہر ملا چھیلا جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں کیا بات ہوئی۔ یہ کون جان سکتا ہے لیکن دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ نہ وہ سُنّی کی پرواہ کرتا ہے اور نہ سُنّی اس کی پرواہ کرتی ہے۔ مگر وہ تو اپنے رنگ میں مست ہے۔ سُنّی جان دیئے دیتی ہے۔"

میں نے کہا: "لیکن تم نے سُنّی کو سمجھایا نہیں؟ اس لونڈے کا کیا بگڑے گا۔ اس کی تو زندگی خراب ہو جائے گی۔"

گوپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی: "بھیا کس دل سے سمجھاؤں۔ سُنّی کو دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی کڑی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکے۔ سُنّی پھوہڑ ہوتی، آرام طلب ہوتی، تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی منہ کالا کرتا پھرے اور تو اس کی پوجا کر۔ میں تو خود یہ ذلت برداشت نہ کر سکتی۔ مرد اور عورت میں بیاہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں سولہ آنے ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ایسے مرد تو کم ہیں جو عورت کی جو برابر کج نگاہی بھی برداشت کر سکیں۔ لیکن ایسی عورتیں بہت ہیں جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ سُنّی ان عورتوں میں نہیں ہے وہ اگر محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی بھی ہے۔ اور اگر شوہر میں یہ بات نہ ہوئی تو وہ اس سے واسطہ نہیں رکھے گی۔ چاہے اس کی ساری زندگی روتے کٹ جائے۔"

یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک سنگھار دان لا کر بولی: "سُنّی اسے اپنے

یہیں چھوڑ گئی ہے اسی لئے آئی تھی۔ یہ وہ گہنے ہیں جنہیں میں نے نہ جانے کتنی تکلیف برداشت کرکے بنوایا تھا۔ ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔ یوں کہو کہ بھیک مانگ کر جمع کئے تھے۔ سُنی اب اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پہنے تو کس کے لئے؟ سنگھار کرے تو کس پر؟ پانچ صندوق کپڑوں کے دیئے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ وہ سب کپڑے اٹھاتی لائی ان چیزوں سے اسے اب نفرت سی ہوگئی ہے۔ بس کلائی میں سونے کی دو چوڑیاں اور ایک اجلی ساڑی یہی اسکا سنگھار ہے۔

میں نے گوپا کو دلاسا دیا۔ کہیں جاکر ذرا کیدارناتھ سے ملونگا۔ دیکھوں تو وہ کس رنگ ڈھنگ کا آدمی ہے۔

گوپا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ نہیں بھیا بھول کر بھی نہ جانا۔ سنّی سنتے ہی جان دے دیگی۔ غیرت کی پتلی ہی سمجھو اسے۔ رسی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتے۔ جن پیروں نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ انھیں وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اُسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنالے لیکن حکومت تو اس نے میری نہ سہی، دوسروں کی کیا سہے گی؟"

میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا لیکن موقع پاتے ہی لالہ مداری لال سے ملا۔ میں راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے باپ بیٹے دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کیدارناتھ نے اس طرح جھک کر چرن چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی سے متاثر ہوگیا۔ جلدی سے اندر گیا اور چائے مربہ اور مٹھائیاں لایا۔ اتنا شائستہ، اتنا شریف اور اتنا خلیق نوجوان میں نے نہ دیکھا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اندر اور باہر میں کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ جب تک رہا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ ٹینس کھیلنے چلا گیا

تو میں نے مداری لال سے کہا۔

"کیدار بابو تو بہت ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں اتنی کشیدگی کیوں ہوگئی ہے؟"

مداری لال نے ایک لمحہ غور کر کے جواب دیا۔" اس کا سبب سوا ئے اس کے اور کیا بتاؤں کہ دونوں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار لڑکوں کو اپنے من کا بنا دیتا ہے۔ میری ساری عمر محنت میں کٹی اب جا کر ذرا راحت ملی ہے۔ رنگ رلیوں کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ دن بھر محنت کرتا تھا، اور شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت بھی اچھی نہ تھی۔ اس لئے برابر یہی فکر سوار رہتی تھی کہ کچھ جمع بھی کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے بال بچے بھیک مانگتے پھریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مہاشہ کو مفت کی دولت ملی، سنک سوار ہوگئی شراب اڑنے لگی۔ پھر ڈرامہ کھیلنے کا شوق ہوا۔ روپے کی کمی تھی نہیں۔ اسپر ماں باپ کے اکیلے بیٹے اُن کی خوشی ہی ہماری زندگی کی بہشت تھی، پڑھنا لکھنا تو دور رہا، آوارگی کی طرف رجحان بڑھتا گیا، رنگ اور گہرا ہوا اور اپنی زندگی کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے فکر ہوئی۔ سوچا بیاہ کر دوں ٹھیک ہو جائیگا۔ گویا دیوی کا پیغام آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ میں سُنی کو دیکھ چکا تھا۔ سوچا ایسی خوبصورت بیوی پا کر اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن اتفاق سے وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ ضدی اور ہٹیلی۔ مفاہمت کا زندگی میں کیا درجہ ہے اس کی اسے خبر ہی نہیں۔ لوہا لوہے سے لڑ گیا۔ یہ ہے سارا بھید۔ اور صاحب میں تو بہو کو ہی زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکے تو سب ہی منچلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں، اُن کی سیوا، قربانی اور محبت، یہی اُن کے وہ ہتھیار ہیں جن سے وہ

وہ اپنے شوہر پر فتح حاصل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ گُن نہیں ہے۔ ناؤ کیسے پار ہوگی۔ خدا ہی جانے۔"

اتنے میں سُنیتا اندر سے آگئی۔ اپنی تصویر کا بالکل مٹا ہوا خاکہ تھی۔ کتے دن تپ کر بھسم ہو گیا تھا۔ مٹی ہوئی تمناؤں کی اس سے اچھی تصویر نہیں ہو سکتی۔ مجھ پر طعن کرتی ہوئی بولی۔" آپ نہ جانے کب سے بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے خبر تک نہیں، اور آپ شاید باہر ہی باہر چلے بھی جاتے۔"

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔" نہیں سُنّی! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ تمھارے پاس آ ہی رہا تھا کہ تم خود آ گئیں۔" لالہ مداری لال کمرے سے باہر اپنی موٹر کی صفائی کرانے لگے۔ شاید مجھے سُنّی سے بات چیت کا موقع دینا چاہتے تھے۔

سُنّی نے پوچھا۔" اماں تو اچھی طرح ہیں؟"

میں نے کہا۔" ہاں وہ تو اچھی ہیں، لیکن تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے۔"

"میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔"

"یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں کیا اَن بَن ہے؟ گویا دیوی جان دئے ڈالتی ہیں۔ تم خود مرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔"

سُنّی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بولی۔" آپ نے ناحق یہ گفتگو چھیڑ دی۔ میں نے تو یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ میں بدنصیب ہوں۔ بس اِن باتوں کا علاج میرے قابو سے باہر ہے۔ میں اس زندگی سے موت کو کہیں بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں اپنی قدر نہ ہو، زندگی کی کوئی دوسری شکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملہ میں کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کی پروا نہیں کرتی۔"

"لیکن ——"

"نہیں چیا جاجی! اس معاملہ میں آپ کچھ نہ کہئے۔ نہیں تو میں چلی جاؤں گی"

"آخر سوچو تو ——"

"میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو انسان بنانا میری طاقت سے باہر ہے"

مئی کا مہینہ تھا۔ میں منصوری گیا ہوا تھا کہ گو یا کا تار پہنچا "فوراً آؤ۔ بہت ضروری کام ہے" میں گھبرا کر دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گو یا تپ دق کی مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا "ستی تو اچھی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "جی ہاں"

"اور کیدار ناتھ"

"وہ بھی اچھی طرح ہے"

"تو پھر ماجرا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں"

"تم نے مجھے تار دے کر بلایا اور پھر کہتی ہو کہ کوئی بات نہیں!"

"دل گھبرا رہا تھا۔ اس سے تم کو بلا لیا۔ ستی کو کسی طرح سمجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی"

"کیا اُدھر کوئی نئی بات ہوئی؟"

"نئی تو نہیں۔ لیکن ایک طرح سے نئی ہی سمجھو۔ کیدار ایک ایکٹرس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا۔ ایک ہفتہ سے کچھ پتہ نہیں۔ ستی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی میں گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سنا ہے کہ کیدار اپنے باپ کے

جعلی دستخط بنا کر کئی ہزار روپیہ بھی بینک سے لے گیا ہے۔"

"تم سُنی سے ملی تھیں؟"

"ہاں تین دن سے برابر جا رہی ہوں۔"

"اگر سُنی نہیں آنا چاہتی تو تم رہنے کیوں نہیں دیتیں؟"

"وہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔"

میں اسی وقت مداری لال کے پاس گیا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی بولے "بھائی صاحب میں تو لٹ گیا۔ لڑکا بھی گیا اور بہو بھی گئی۔"

معلوم ہوا کہ جب سے کیدار غائب ہو گیا ہے، سُنی اور بھی اُداس رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ آج صبح وہ جمنا اشنان کرنے گئی۔ اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو نہیں جگایا۔ جب دن چڑھ گیا اور بہو گھر میں نہ ملی تو اس کی تلاش ہونے لگی۔ دوپہر کو پتہ ملا کہ جمنا گئی ہے۔ لوگ ادھر بھاگے وہاں اس کی لاش ملی۔ پولیس آئی۔ لاش کا معائنہ ہوا۔ اب لاش واپس ملی ہے۔ میں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ ارتھی کے ساتھ گیا اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ خبر پا کر گوپا کی کیا حالت ہوگی۔ اس ابھاگن کے باغِ تمنا میں یہی ایک پودا تھا۔ اسے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پال رہی تھی۔ اس کے بسنت کا سنہرا خواب ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی پھول کھلیں گے پھل آئیں گے، چڑیاں اس کی ڈالیوں پر بیٹھ کر اپنے سہانے راگ گائیں گی، لیکن آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کی زندگی اب بیکار تھی۔ وہ نقطہ ہی مٹ گیا تھا جس پر زندگی کے تمام

خطوط آ آکر ملتے تھے۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا ایک لالٹین لئے نکلی۔ میں نے گوپا کے چہرے پر سکون کی ایک نئی جھلک دیکھی۔ اس نے مجھے غمگین دیکھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "آج تو تمھیں سارے دن روتے ہی کٹا۔ لاش کے ساتھ تو بہت آدمی ہوں گے میرے جی میں بھی آیا تھا کہ چل کر سُنی کا آخری درشن کرلوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سُنی ہی نہ رہی تو اُس کی لاش میں کیا رکھا ہے۔ نہ گئی"۔

میں حیرت سے گوپا کا منھ دیکھنے لگا ——— تو اسے اس افسوسناک حادثہ کی اطلاع مل گئی تھی لیکن وہ کسقدر صابر و پُرسکون ہے۔ میں نے کہا "اچھا کیا تم نہ گئیں۔ رونا ہی تو تھا"۔

گوپا نے کہا "ہاں اور کیا۔ روئی تو یہاں بھی لیکن تم سے سچ کہتی ہوں کہ دل سے نہیں روئی۔ نہ جانے آنسو کس طرح نکل آئے۔ مجھے تو درحقیقت سُنی کی موت سے خوشی ہوئی۔ بدنصیب اپنی غیرت و خودداری کے لئے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ اس لئے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھادی۔ عورت کو زندگی میں محبت نہ ملے تو اُس کا مرجانا ہی اچھا ہے ——— تم نے سُنی کی لاش دیکھی تھی؟ لوگ کہتے ہیں ایسا جان پڑتا تھا کہ مسکرا رہی ہے۔ میری سُنی سچ مچ دیوی تھی۔ بھیا انسان اسلئے تھوڑے ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ زندگی میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے؟ کس لئے جئے؟ کھانے اور سونے اور مرجانے کے لئے؟ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سُنی کی یاد نہ آئے گی یا میں اسے یاد کرکے روؤنگی نہیں لیکن وہ غم کے آنسو نہ ہوں گے۔ خوشی کے آنسو ہوں گے۔ بہادر بیٹے کی ماں اُس کی بہادری سے خوش ہوتی ہے۔ سُنی کی

موت کیا کم باعثِ فخر ہے؟ میں آنسو بہا کر اُس فخر کو کیوں برباد کروں؟ وہ جانتی ہے کہ چاہے ساری دنیا اس کی مذمّت کرے، اس کی ماں اس کی تعریف ہی کرے گی۔ اس کی روح سے یہ مسرت بھی چھین لوں؟ لیکن اب رات زیادہ ہو گئی ہے اوپر جا کر سو رہو۔ میں نے تمہاری چارپائی بچھا دی ہے۔ مگر دیکھو اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔ سَتی نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا۔ اِس کے پِتا ہوتے تو آج سَتی کی مورت بنا کر پوجتے۔"

* * *

روشنی

آئی سی۔ ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقہ میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلہ ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی۔ اس لئے سیرو شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے۔ سوچتا تھا وہ دن کب آئیگا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شاندار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ میں دورہ پر نکلا اور نندھوار کے تھانہ کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانہ کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی۔ مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوشگوار نہیں، ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی محافظت کا بھی خیال تھا کیونکہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا، بیٹا چلو، ڈھائی تین گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دئے گئے تھے۔

جا بجا کاشتکار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی اُکھ اور خربوزے کے لئے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔

وہی بابا آدم کے زمانہ کا بوسیدہ ہل، وہی افسوسناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی۔ اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاح پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسہ میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوادوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانہ میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا، لیکن اس سلف پرستی سے کیا حاصل؟ آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت و حرفت کی بدولت۔ بیشک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغامِ عمل عطا کیا ہے۔ اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے، جہاں آج بھی نیم برہنہ، گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ جہاں آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے، اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا۔ افق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ آندھی کی علامت تھی۔

میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لمحہ بہ لمحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ و تنہا طوفان سے مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہو گئی، وہ پردۂ غبار سر پر آ پہنچا۔ اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الامان، گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں مُنہ چھپا لیا۔ سنگریزے گرد کے ساتھ اُڑ کر مُنہ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلّط ہو گئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آ جاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آ جائے تو بس خاتمہ ہے۔ ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فیٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دیگا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں، کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلے۔ اُفوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً چھن چھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس ارراہٹ میں بھی چھن چھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی۔ مگر آسے راستہ کیونکر سوجھ رہا ہے کہیں سانڈنی ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمیندار ہوگا۔ مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں۔ چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے۔ مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحہ میں چھن چھن کی آواز قریب آگئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی جارہی ہے ایک گز کے فاصلے سے بھی اسکا صرف دُھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہوکر اکیلی مردانہ وار چلی جارہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے، نہ لوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرّہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے اپنے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اُس سے بولا۔ او عورت! کجن پور یہاں سے کتنی دُور ہے؟

میں نے پوچھا تو بلند لہجہ میں۔ مگر آواز دس گز بھی نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اُس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخکر پکارا۔ "او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ کجن پور یہاں سے کتنی دُور ہے"؟

عورت رُک گئی۔ اُس نے میرے قریب آکر مجھے دیکھ کر ذرا سر جھکا کر کہا۔ "کہاں جاؤ گے"؟

"کجن پور کتنی دُور ہے"؟

"چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔"

"تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟"

"وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔"

"تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟"

"چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔"

آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا میں شاید دو تین قدم پیچھے کھسک گیا۔ گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفہ نے کہا اس عورت کے لئے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی لوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعثِ نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیونکر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا، شتر مرغ کی طرح جو خطرہ سے بچنے کی کوئی راہ نہ پاکر بالو میں سر چھپا لیتا ہے۔

(۲)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہانتک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہوگیا۔ نہ گرد و غبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آگئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہونگے، سامنے ایک پہاڑی تھی اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جونہی اس گاؤں میں پہنچا وہی عورت ایک بچے کو گود میں لئے میری طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا "تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ

نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈنے جارہی تھی۔

میں نے اُس کی انسانیت سے متاثر ہوکر کہا "میں اِس کے لئے تمہارا بہنا، ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہوگیا یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دُور ہوگا؟"

"بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے کہیں دہنے بائیں مُڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔"

"یہی تمہارا بچہ ہے؟"

"نہیں ایک اور اِس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جاکر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اُڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اُترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا تو شیطان ہے، لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں، بابوجی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں، من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔"

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث اندازِ گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا۔ اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا "تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہو گئے؟"

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی۔

"ابھی تو کُل چھ مہینے ہوئے ہیں بابوجی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس۔ بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی، بس آنکھیں بند ہوگئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سُنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا

تب سے بابوجی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچّوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھئے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دئیے۔ بھگوان تمہارے اِن دونوں گلاموں کو جلا دے۔ میرے لئے یہی بہت ہیں "

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں، اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اِس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آبدیدہ ہوگیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اُس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لئے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤنگا۔ یہ کہہ کر میں نے بچّے کے رخساروں کو انگلی سے چھُو دیا "

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی "نہیں بابوجی، یہ رہنے دیجئے۔ میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں "

"یہ بھیک نہیں ہے۔ بچّوں کے مٹھائی کھانے کے لئے ہے "

"نہیں بابوجی "

" مجھے اپنا بھائی سمجھ کرلے لو "

"نہیں بابوجی۔ جب سے بیاہ ہوا اُس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی "

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنہیں میں جاہل، کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا اُسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل۔ اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہوگیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے

پوچھا "تمھیں اس آندھی میں ذرا بھی ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟"

عورت مسکرائی "ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں، تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آکر بیٹھے بیٹھے چل دیا آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پورا کیلے نہ جانے پاتے۔ جاکر تمہیں پہنچا آتا۔ تمہاری خدمت کرتا۔"

گھوڑا اُڑا۔ میرا دل اُس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پڑا پاکر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے۔ وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے آج مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعدالطبیعات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اُس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا، ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے اُڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپالوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(۳)

گجن پورا بھی ۵ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ۔ بیہڑ بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا ہوا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اُس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر اُفق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی ایک نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زردلیپ کرتی ہوئی، تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی

یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکایک سامنے ایک کفِ دست میدان آگیا جس کے پرلے سرے پر جن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آرہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی۔ لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اُڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کردی۔ گھوڑا اُڑا۔ میں اُس کی تیزی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہونگا کہ ایک رپٹ آپڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا ہے۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی کیونکہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلاّ کر کہا "بڈھے اور داہنے کو ہوجا"۔

بڈھا چونکا۔ اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا، اور بائیں کی طرف ہولیا۔ اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اُسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اُس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آگیا۔ کیا اِس اندھے کو مرنے کے لئے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگوں؟ حمیّت نے اِسے

گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا۔ میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ ریٹ کے لئے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فیٹ چوڑی ریٹ تو بنا دی، مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اُسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا۔ لیکن تیرنا جانتا تھا۔ کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اُسے لئے ہوئے بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اُس نیم جان لاش کو لئے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اُٹھتا تھا۔ لیکن اِس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ میں اگر اُس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں، تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے۔ مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اُس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص ایسی حالت میں جبکہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لمحہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ کردے مگر میں خوش تھا کیونکہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا لیکن مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد کی (فرسٹ ایڈ) کچھ مشق کی تھی۔

وہ اسوقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اُس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اُس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور رگجن پور چلا۔ بے خوف، بے خطر دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اُسی وقت اندھے نے پوچھا "تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو"

میں نے کہا "تمہارا خادم ہوں"

"تمہارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے"

"ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے!"

"وہ کون دیوی ہے؟"

"وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے"

"تو کیا وہ عورت ہے؟"

"نہیں میرے لئے تو وہ دیوی ہے"

مالکن

(۱)

شیو داس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمّہ ہے۔ میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا۔ نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا نام کرنے والا تو کوئی چاہئے۔ اب ہل توڑ دوں تو گذر نہ ہوگی۔ اس لئے برجو ہل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا، رکھنے اٹھانے والا تمہارے سوا دوسرا کون ہے؟ روو مت بیٹا! بھگوان کی جو مرضی تھی وہ ہوا۔ اور جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ ہمارا تمہارا کیا اختیار ہے۔ میرے جیتے جی تمہیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ برجو گیا تو میں تو ابھی بیٹھا ہی ہوں۔"

رام پیاری اور رام دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو دو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور آرام سے رہنے لگیں۔ شیو داس کو فرصت ملی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا۔ آباد گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی لیکن خدا کی مرضی، بڑا لڑکا برجو بیمار پڑا، اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہو گئے۔ آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی۔ اور شیو داس نے سچے بہادر کی طرح کارزارِ حیات کے لئے کمر باندھ لی۔ دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو۔ اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آج اپنی بہو کو دیکھ کر ایک آن کے لئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی

آواز میں اُسے دلاسا دینے لگا۔ شاید اس نے سوچا تھا۔ کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پُچھ جائیں گے۔ کم سے کم اُسے اتنی محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے دادا کہ تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن کر بیٹھوں۔ کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا۔ بیٹھے بیٹھے تو رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔"

شیوداس نے سمجھایا۔ "بیٹا بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں۔ رونے دھونے سے ہلکان ہونے کے سوا اور کیا ہاتھ آئے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں۔ کوئی سادھو سنت آجائے، کوئی مہمان آپہنچے، اس کی خاطر مدرات کے لئے کسی کو تو گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔"

بہو نے بہت حیلے کئے پر شیوداس نے ایک نہ سُنی۔

(۳)

شیوداس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اُٹھالی تو اس کے دل میں اختیار اور ذمہ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے شوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہوگیا۔ اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔ شیوداس باہر تھا۔ گھر بالکل خالی تھا۔ اس وقت وہ بے فکر ہو کر بھنڈار کو کھول سکتی ہے۔ اس میں کیا کیا سامان ہے۔ کیا کیا چیز ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اسکا دل بیتاب ہوگیا۔ اس مکان میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیوداس آکر اس کوٹھری کو کھولتا۔ پھر اسے بند کر کے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا۔ رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی۔ مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے گھر کے لئے وہ کوٹھری ایک طلسم یا راز تھی جس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات

پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کر دیا کہ اسے کوئی بھنڈارا کھولتے نہ دیکھ لے۔ نہیں تو سوچیگا کہ بے ضرورت اس نے کیوں کھولا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا، کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر پاؤں رکھا تو اسے اسی طرح کی لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی، جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی پٹاری کھولتے میں ہوتی تھی۔ مٹکوں میں گڑ، شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے، جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے جاتے تھے یا مانگے دیئے جاتے تھے۔ ایک جگہ مالگذاری کی رسیدیں اور لین دین کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ کوٹھری پر شان و شوکت چھائی ہوئی تھی۔ اسی کے سایہ میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹہ تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے دل پر نشہ سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ اس کوٹھری سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بالکل بدلی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔

اسی وقت دروازے پر کسی نے آواز دی۔ اس نے فوراً بھنڈارہ کا دروازہ بند کیا اور جا کر صدر دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو پڑوسن جھنیا کھڑی ایک روپیہ قرض مانگ رہی ہے۔

رام پیاری نے بے رخی سے کہا "ابھی تو ایک پیسہ بھی گھر میں نہیں ہے۔ بہن کام کاج میں سب خرچ ہو گیا"

جھنیا حیران رہ گئی۔ چودھری کے گھر میں اس وقت ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی۔ جس کے ہاں سیکڑوں کا لین دین ہے، اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صرف نہیں ہو سکتا۔ اگر شیوداس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو

اسے تعجب نہ ہوتا۔ رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لئے گاؤں میں مشہور تھی۔ اکثر شیو داس کی نگاہیں بچا کر ہمسایوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دیا یا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے گہنے تک مانگے دے دیا کرتی تھی۔ بخیل شیو داس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

جھنیا نے متعجب ہو کر کہا "ایسا نہ کہو بہن۔ بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں نہیں تو تم جانتی ہو کہ میری عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیہ دینا ہے۔ پیادہ دروازے پر کھڑا بک جھک رہا ہے۔ روپیہ دے دو تو کسی طرح مصیبت ٹلے۔ میں آج کے آٹھویں روز آکر دے جاؤں گی۔ گاؤں میں اور کون گھر ہے۔ جہاں مانگنے جاؤں"۔

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ پہلے چاول دال چننا وبال معلوم ہوتا تھا اور رسوئی میں جانا تو سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی۔ آخر میں شیو داس آکر کہتا کہ کیا آج کھانا نہ پکیگا۔ اسوقت دونوں میں سے ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑ پکا کر رکھ دیتی۔ جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔ بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں۔ اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ دروازہ ایسا صاف ہونا چاہئے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جائے یہ نہیں کہ ابکائی آنے لگے۔ ابھی کہدوں تو تنک اٹھیں۔ اچھا! یہ منی ناند سے الگ

کیوں کھڑی ہے؟

اس نے مٹی کا ئے کے پاس جا کر ناند میں جھانکا۔ بدبو آ رہی تھی۔ ٹھیک ہے، معلوم ہوتا ہے، مہینوں سے پانی نہیں بدلا گیا ہے۔ اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا چھٹی ہوئی، اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں۔ مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے، وہ بھی تین کوڑی کا۔ کھانے کو ڈیڑھ سیر، کام کرنے نانی مرتی ہے۔ آج تو پوچھتی ہوں ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا۔ رہنا ہو رہے یا جائے۔ آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔

آخر اس سے نہ رہا گیا۔ گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا "پانی کیا ہو گا بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے"

پیاری نے کہا "ناند کا پانی سڑ گیا ہے۔ بھینس بھوسے میں منہ نہیں ڈالتی دیکھتے ہو کوس بھر پر کھڑی ہے۔"

شیوداس مسکرایا۔ دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

(۳)

کئی مہینے گذر گئے۔ پیاری کے اختیار میں آکر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھئے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے، گھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیاری نہ خود آرام کرتی ہے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے۔ گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے،

کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے۔ کسی کو گہنے کی دھن سوار ہے۔ ہاں اگر کوئی متردد و فکرمند اور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے۔ پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہانتک کہ بوڑھے شیوداس بھی کبھی کبھی اس کی بدگوئی کرتے ہیں۔ کسی کو پہر رات رہے اٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ محنت سے سب ہی جی چراتے ہیں۔ پھر بھی اتنا سب ہی جانتے ہیں کہ پیاری نہ ہو تو گھر کا کام نہ چلے۔ اور تو اور اب دونوں بہنوں میں بھی اتنا میل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لاکر پیاری کے سامنے پٹک دئے، اور بگڑ کر بولی۔ "لے کڑے بھی بھنڈار میں بند کردے"۔

پیاری نے کڑے اٹھا لئے اور نرم لہجہ میں کہا "کہہ تو دیا ہاتھ میں روپے آنے دے بنوا دوں گی، ابھی تو ایسے گھس نہیں گئے ہیں کہ آج ہی اتار کر پھینک دئے جائیں"۔

دُلاری لڑنے کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ بولی "تیرے ہاتھ میں کا ہے کو کبھی روپے آئیں گے، اور کا ہے کو کڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزہ آتا ہے نا"۔

پیاری نے ہنس کر کہا "جوڑ جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لئے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے۔ یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں۔ میرا بازو بند کب کا ٹوٹا پڑا ہے"۔

دُلاری "تم نہ کھاؤ، پہنو۔ نیکنامی تو ہوتی ہے تمہاری۔ یہاں کھانے پہننے کے سوا اور کیا ہے؟ میں تمہارا حساب کتاب نہیں جانتی۔ میرے کڑے آج بننے کو بھیج دو"۔

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز میں پوچھا "روپے نہ ہوں تو کہاں سے

لاؤں ؟"

دلاری نے چیخ کر کہا۔" مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو کپڑے چاہتی ہوں۔"

اسی طرح گھر کے سب ہی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت سُست سنا جاتے تھے۔ اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہی ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرنے، اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طعن وطنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتی ہے، وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لئے اتنا کافی تھا۔

گاؤں میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے لیکن تمام گھر کو سنبھالے ہوئے ہے۔ چاہتی تو دوسرا گھر کر کے چین کرتی۔ اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹا رہی ہے کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں۔ جیسے کایا پلٹ ہو گئی۔

چند روز کے بعد دلاری کے کپڑے بن کر آ گئے۔ پیاری خود سُنار کے گھر دوڑ دوڑ کر گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ دلاری اور متھرا کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کپڑے دلاری کو دئیے۔ دلاری نہال ہو گئی۔ چٹ پٹ کپڑے پہنے اور دوڑی ہوئی جا کر کوٹھری میں متھرا کو کپڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھری کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں دلاری اس سے کل تین ہی سال تو چھوٹی ہے۔ لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اسی منظر پر جم گئیں۔ متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت ان کی وہ محبت آگیں

محبت، اُن کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہانتک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ ناگہاں شیبو داس نے پکارا۔ "بڑی بہو۔ ایک پیسہ دو۔ تمباکو منگاؤں۔"

پیاری کا سلسلۂ تصوّر شکست ہو گیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈاریں پیسہ لینے چلی گئی۔

(۴)

ایک ایک کرکے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گاؤں میں سب سے خوشحال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔ کبھی مکان کی مرمّت کے لئے، کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لئے، کبھی رشتہ داروں کی خاطر مدارات کے لئے، اور کبھی مریضوں کے علاج کے لئے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اور جب بہت توڑ جوڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی۔ اور وہ چیز ایک بار ہاتھ سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان میں سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی لیکن جہاں عزت کی بات آپڑتی تھی، وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی اگر گاؤں میں ہیٹی ہو گئی تو کیا بات رہی، اسی کی تو بدنامی ہوگی۔ دُلاری کے پاس بھی گہنے تھے، ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں۔ لیکن پیاری اُن کی چیزیں نہ چھوتی۔ ان کے کھانے پہننے کے دن ہیں، وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسیں۔ دُلاری کے لڑکا ہوا تو پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ

شیوداس نے مخالفت کی "کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔"

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی "کیسی بات کرتے ہو دادا! پہلونٹی کے لڑکے کے لئے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہوگی؟ دل تو نہیں مانتا۔ پھر دنیا کیا کہے گی؟ نام بڑے درشن تھوڑے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ اپنا تمام سامان کر لوں گی۔"

"گہنے کے سر جائے گی اور کیا؟" شیوداس نے فکر مند ہو کر کہا۔ "اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا۔ کتنا سمجھایا۔ بیٹا! بھائی، بھاوج کسی کے نہیں ہوتے۔ اپنے پاس دو چیزیں رہیں گی تو سب مُنہ تکیں گے نہیں تو کوئی سیدھے مُنہ بات بھی نہ کرے گا۔"

پیاری نے ایسا مُنہ بنایا، گویا وہ ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے۔ بولی "جو اپنے ہیں وہ بات بھی نہ پوچھیں، جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں۔ میرا دھرم میرے ساتھ ہے، ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے۔ مر جاؤں گی تو کیا سینے پر لادے جاؤں گی؟"

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی۔ برھی کے روز ساری برادری کا کھانا ہوا۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا، نومولود بچہ کے دیکھنے کے لئے اس کا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ دُلاری زچہ خانے سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اُتر گیا تھا لیکن آج چہرے پر صحت کی سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ مادرانہ غرور و ناز نے اعضا میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ زچہ خانے کی احتیاط اور مقوی چیزوں

کے استعمال نے بدن کو چکنا دیا تھا۔ متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا۔ اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے۔ بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔

آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے یہ پُرلطف تماشہ دیکھنے لگی۔ ماں اور باپ دونوں باری باری بچہ کو چومتے اور گلے لگاتے اور اس کے منہ کو تکتے تھے۔ کیسی پُرکیف مسرت تھی۔ پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لئے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔ جس طرح لگام سے منہ بند، بوجھ سے لدا ہوا، ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ دوڑتے دوڑتے بیدم، گھوڑا ہنہناہٹ کی آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے۔، اپنی حالت کو فراموش کر کے ایک دبی ہوئی ہنہناہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے، کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہو گئی۔ اس کی مادریت جو پنجرہ میں بند خاموش بے جان پڑی ہوئی تھی، قریب سے گذرنے والی مادریت کی چہکار سے بیدار ہو گئی۔ اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لئے بازو پھڑپھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا۔ "یہ میرا لڑکا ہے۔"

دُلاری نے بچہ کو سینے سے چمٹا کر کہا۔ "ہاں، ہے کیوں نہیں۔ تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ مصیبت تو میں نے بھگتی۔ باپ کہلانے کے لئے تم آ گئے۔"

متھرا۔ "میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت و شکل سب میری سی ہے کہ نہیں؟"

دُلاری۔ "اس سے کیا ہوتا ہے۔ بیج بنئے کے گھر سے آتا ہے،

کھیت کسان کا ہوتا ہے۔ پیداوار بنئیے کی نہیں ہوتی۔ کسان کی ہوتی ہے"۔

متھرا۔" باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کرونگا"۔

دُلاری۔" میرا لڑکا پڑھے لکھیگا۔ کوئی بڑا عہدہ حاصل کرے گا۔ تمہاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلیگا۔ مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوا دیں"۔

متھرا۔" اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا۔ اور کھیچ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا"۔

دُلاری۔" یہ مہارانی جینے دے گی"۔

متھرا۔" مجھے تو اس بیچاری پر ترس آتا ہے۔ اس کے کون بیٹھا ہے۔ ہمیں لوگوں کے لئے تو مرتی ہے۔ بھیا ہوتے تو اب تک دو تین لڑکوں کی ماں ہو گئی ہوتی"۔

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایسا سیلاب اُمڈا کہ اس کے روکنے میں اسکا تمام جسم کانپ اٹھا۔

اس کی بیوگی کا سوناپن کسی خوفناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔ تصور اس بنجر زمین میں ہرا بھرا باغ لگانے لگا۔

یکایک شیوداس نے اندر آکر کہا۔" بڑی بہو کیا سو گئی! باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا۔ کیا کہہ دوں"؟

(۵)

کچھ دنوں کے بعد شیوداس بھی مر گیا۔ ادھر دُلاری کے دو بچے ہوئے زیادہ تر بچوں کی پرورش و برداخت میں رہنے لگی۔ کھیتی کا کام مزدوروں پر آپڑا متھرا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا۔ اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ خود پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا، بعد کو باپ کی نگرانی

میں کرنے لگا۔ کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا وہی مزدور اس کے ہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے۔ اس لئے اب پیاری کو دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے، کہنے کو تو وہ اب بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت گزار تھی۔ مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمیندار کا پیادہ بھی اسی پر دھونس جماتا کھانے میں بھی کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو تو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیئے۔ دلاری تو بچوں والی تھی، اسے بھی پوری خوراک چاہیئے۔ متھرا گھر کا سردار تھا۔ اس حق کو اس سے کون چھین سکتا تھا؟ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے تھے۔ ساری کسر بیچاری پیاری پر نکلتی تھی۔ اسی کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے، جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تھا تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی۔ مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا۔ ”بھابی! اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں۔ کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہیں۔ وہ بھی رو دھو کر۔ کئی آدمی پورب سے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں دو تین روپے روز کی مزدوری ہوتی ہے۔ چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤنگا۔ اب لڑکے بالے ہوئے ان کے لئے تو کچھ کرنا ہی چاہیئے۔“

دلاری نے تائید کی۔ ”ہاتھ میں چار پیسے ہونگے۔ لڑکوں کو پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ ہماری تو کسی طرح کٹ گئی۔ لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔“

پیاری یہ رائے سن کر حیران رہ گئی۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یہ دھن کیسے سوار ہو گئی۔ اسے

شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔
بولی" تو میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمہاری جیسی خواہش ہو۔ لڑکوں کے پڑھانے لکھانے کے لئے یہاں بھی اسکول ہیں۔ پھر کیا ہمیشہ ایسا ہی وقت رہے گا۔ دو تین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔"
متھرا" اتنے روز کھیتی کرتے ہو گئے۔ جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بنے گی اسی طرح ایک روز چل دیں گے۔ دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پاؤں بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا۔ لڑکوں کو اس چکی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔"
پیاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا" بھیا گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لئے نہ دوڑنا چاہئے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو۔ مجھے ایک ٹکڑا دے دینا پڑی رہوں گی۔"
متھرا گلو گیر آواز سے بولا" بھابی یہ تم کیا کہتی ہو۔ تمہارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھلا ہے نہیں ختم ہو چکا ہوتا۔ اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا۔ اپنا جسم تک گھلا ڈالا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں ہم لوگوں کو جانے دو۔ بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا۔ تمہارے لئے ہم برابر خرچ بھیجتے رہیں گے۔"
پیاری نے کہا" اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ۔ بال بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھرو گے؟"
دلاری بولی" یہ کیسے ہو سکتا ہے بہن! یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں گے۔ بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا۔ دوڑ دوڑ کر گھر آئیں گے، اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی۔ پردیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا، اتنے

میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔"

پیاری بولی "تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو۔"

دُلاری اُسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی۔ کچھ روز رنڈاپے کا لطف اُٹھانا چاہتی تھی۔ اگر پردیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی بہن۔ "تو چلتی تو کیا بات تھی۔ لیکن پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ تم تو کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی۔"

روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوا پوری پکائی۔ جب سے اس گھر میں آئی کبھی ایک روز کے لئے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ آج اس ہولناک موقع کو سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے۔ دلاری بھی خوش ہے۔ لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں، تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے محبت و ہمدردی کو پیروں سے کچل ڈالے لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کھا کر پلی تھی۔ اسے اپنے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بیقرار ہونے سے نہ رُک سکی۔ دُلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی، جیسے کوئی میلا دیکھنے جا رہی تھی۔ نئی چیزوں کے دیکھنے، نئی دنیا کی سیر کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پیاری کے سر تمام انتظام کا بار تھا۔ دھوبی کے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں۔ کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے۔ سفر کے خرچ کے لئے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی۔ ایک بچے کو کھانسی آرہی تھی، دوسرے کو کئی روز سے دست آرہے تھے۔ ان دونوں کی دواؤں کو کوٹنا پیسنا وغیرہ سیکڑوں کام اُسے مصروف کئے ہوئے تھے۔ لاولد ہو کر بھی وہ بچوں کی داشت و پرداخت

میں دُلاری ـ سے ہوشیار تھی۔ دیکھو بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت۔ مارنے سے بچّے ضدّی اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بنانا پڑتا ہے کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے۔ کبھی ہنسنا پڑتا ہے اگر تم چاہو کہ ہم آرام سے پڑے رہیں، اور بچے چپ چاپ بیٹھے رہیں، ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں تو یہ نہیں ہوسکتا۔ بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں۔ انھیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔ دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھڑکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔"

دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی، گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔

رخصت کا روز پیاری کے لئے امتحان کا دن تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا کہیں چلی جائے تاکہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سونا ہو جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی، کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اسکا دل لرز جاتا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے حواس معطل ہوتے جاتے تھے۔ وہ کوئی کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی۔ اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی، کہ یہ لوگ اپنے ہوتے تو کیا اس طرح چلے جاتے؟ یہ مانا کہ ناتہ ہے، مگر کسی پر کوئی زور تو نہیں۔ دوسرو کے لئے کتنا ہی مرو، پھر بھی اپنے نہیں ہوتے۔ پانی تیل میں کتنا ہی ملے، پھر بھی الگ ہی رہے گا۔ بچے نئے نئے کپڑے پہنے نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انھیں پیار کرنے کے لئے گود میں لینا چاہتی تو رونے کا سا منہ بنا کر چھڑا کر بھاگ جاتے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر اکثر اپنے بچے بھی ایسے ہی بے مروت ہو جاتے ہیں۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے

اس پر جا بیٹھے۔ گاؤں کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اُسوقت ان کا آنا بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل کر رونا چاہتی تھی۔ متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا۔ تمہارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے؟ لیکن گڑبڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا۔ متھرا اور دُلاری دونوں گاڑی میں جا بیٹھے۔ اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہ گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی، کہ اسے گاؤں کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(۶)

کئی روز تک پیاری بیہوش سی پڑی رہی۔ نہ گھر سے نکلی، نہ چولہا جلایا نہ ہاتھ مُنہ دھویا۔ اس کا ہلواہا جوکھو بار بار آ کر کہتا "مالکن۔ اٹھو۔ منہ ہاتھ دھوؤ۔ کچھ کھاؤ۔ پیو۔ کب تک اس طرح پڑی رہوگی؟"

اس طرح کی تسلّی گاؤں کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں لیکن ان کی تسلّی میں ایک قسم کے بغض کا انداز پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی ہمدردی جھلکتی تھی۔ جوکھو کام چور باتونی اور نشہ باز تھا۔ پیاری اسے برابر ڈانٹتی رہتی تھی۔ دو ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی۔ مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سُن کر پیاری جھنجھلاتی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا۔ یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے۔ مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اسوقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پھل کانٹے دار درخت میں بھی ملیں تو کیا انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے؟

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی۔ زندگی کا کاروبار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو۔ اور کھیتوں کو

اٹھا دو۔ لیکن پیاری کی وضعداری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کر سکتی تھی۔ تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ اِدھر متھرا کے خط و کتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے گھر سے بیٹھی ہوں۔ یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعویٰ رکھتی ہوں۔ اس کے بھیجے سے مجھے کوئی خزانہ نہ مل جاتا۔ اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اس کی کب پروا کرتی ہوں۔ گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں۔ پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی۔ خربوزے بوئے تھے، وہ خوب پھلے اور خوب بکے پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا، اب بکنے لگا۔ پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی۔ مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی۔ زیوروں کا بھی شوق ہوا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا۔ اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں۔ تالاب میں پانی جمع ہونے لگا۔ اب اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں۔ کھلے ہوئے کنول بھی تھے۔ ایک روز جوکھو کنوئیں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پوچھا "اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟"

جوکھو نے کہا "چار کیاریاں بچ رہی تھیں۔ میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں۔ کل کا جھنجٹ کون رکھے۔"

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا۔ جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پیاری سارے دن کنوئیں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی اس لئے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پانی کا ابالا رکھنے

ہوئے کہا "اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو"۔

"آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے۔ کیا جلدی تھی"۔

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگذاری کی تھی۔ اور سمجھا تھا تعریف ہوگی۔ یہاں اعتراض ہوا۔ چڑکر بولا۔ "مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو۔ جو بات نہیں سمجھتی ہو اس میں کیوں کودتی ہو۔ کل کے لئے تو اونچے کے کھیت پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے۔ سویرے میں نہ پہنچتا تو کوئی اور آکر ڈٹ جاتا۔ پھر ہفتہ بھر تک راہ دیکھنی پڑتی تب تک تو سب اوکھ بدا ہو جاتی"۔

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی "ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں پاگل۔ میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر۔ کہیں بیمار پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے"۔

جوکھو "کون بیمار پڑ جائے گا۔ بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا آئندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں"۔

پیاری "میں کیا جانوں تمھیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے۔ اور پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ بخار آگیا تھا۔ پیٹ میں درد تھا"۔

جوکھو جھینپتا ہوا بولا "وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے اسے ڈبو ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں، میرے ہی سر ہے۔ میں نہ کروں گا تو سب چوپٹ ہو جائے گا"۔

پیاری "میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی"؟

جوکھو "تم بہت کرو گی دو وقت چلی جاؤ گی۔ تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں

رہ سکتیں۔"

پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا۔ بولی۔"تو اتنی رات گئے چولھا جلاؤ گے۔ بیاہ کیوں نہیں کر لیتے"؟

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا۔"تم بھی خوب کہتی ہو مالکن! اپنے پیٹ بھر کو تو ہوتا نہیں۔ بیاہ کر لوں! سوا سیر کھاتا ہوں ایک وقت۔ پورا سوا سیر۔ دونوں وقت کے لئے ڈھائی سیر چاہئے۔"

پیاری۔"اچھا۔ آج میری رسوئی میں کھاؤ۔ دیکھوں کتنا کھاتے ہو۔"

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا۔"نہیں مالکن! تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی ہاں آدھ آدھ سیر کی دو روٹیاں پکا دو تو کھا لوں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنا لیتا ہوں اور اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی میٹھے سے کبھی نمک سے کبھی پیاز سے کھا لیتا ہوں اور آ کر پڑ رہتا ہوں"

پیاری۔"میں تمہیں آج پھلکے کھلاؤں گی۔"

جوکھو۔"تب تو ساری رات کھاتے ہی گذر جائے گی۔"

پیاری۔"بکو مت۔ جلدی آ کر بیٹھ جاؤ۔"

جوکھو۔"ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں۔"

(۷)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا۔"میں کہتی ہوں کہ دھان روپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جھڑی لگ جائے تو کھیت ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے۔" جوار باجرہ، سن، ارہر سب تو ہیں۔ دھان نہ سہی۔

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا۔"جب سب کا ہو گا

تو میرا ہی ہوگا۔ سب کا ڈوب جائیگا تو میرا بھی ڈوب جائیگا۔ میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں۔ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں رویا جاتا تھا۔ پر جو بھیا نے اس میں ایک دو بیگھے اور بڑھا دیئے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت رو دیئے۔ تو کیا میں سب سے گیا گذرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤنگا۔ تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے۔"

"میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں۔ دونوں کے برابر کام کیوں نہ کرونگا۔" "چل جھوٹا کہیں کا۔ کہتا تھا دو سیر کھاتا ہوں۔ چار سیر کھاتا ہوں، آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔"

"کسی روز تولو تو معلوم ہو۔"

"تو ایسے بڑے کھانے والے ایں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو مزدور ملیں گے نہیں تمہیں ہلکان ہونا پڑے گا۔"

"تمہاری بلا سے میں ہلکان ہونگا نا! یہ بدن کس روز کام آئیگا۔"

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی۔ "پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہوگے۔ نہ نہ میرا دل گھبرائیگا۔"

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا۔ کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑ کر سو رہے دل کیوں گھبرائیگا۔ بولا جی گھبرائے تو سو رہنا۔ میں گھر رہونگا تب تو اور جی گھبرائیگا۔ میں بیکار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے۔ باتوں میں دیر ہو رہی ہے اور بادل گھرے آتے ہیں۔"

پیاری نے کہا۔ "اچھا کل جانا۔ آج بیٹھو۔"

جوکھو نے گویا مجبور ہو کر کہا۔ "اچھا بیٹھ گیا۔ کہو کیا کہتی ہو۔"

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ کہنا کیا ہے۔ میں تم سے پوچھتی

ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے ہیں اکیلی مرا کرتی ہوں، تب ایک سے دو تو ہو جائیں گے"

جوکھو شرماتا ہوا بولا" تم نے پھر وہی بے بات کی بات چھیڑ دی مالکن! کس سے بیاہ کر لوں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں گا جو گہنے کے لئے جان کھاتی رہے"

پیاری" یہ تو تم نے بڑی کڑی شرط لگائی۔ ایسی عورت کہاں ملے گی جو گہنے نہ چاہتی ہو"

جوکھو" یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ وہ گہنا نہ مانگے۔ ہاں میری جان نہ کھائے تم نے تو کبھی گہنے کے لئے ضد نہیں کی بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دیدیئے"

پیاری کے رخساروں پر ہلکا سا رنگ آگیا۔ بولی" اچھا اور کیا چاہتے ہو؟"

جوکھو" میں کہنے لگونگا تو بگڑ جاؤ گی"

پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بولی" بگڑنے کی بات ہوگی تو ضرور بگڑوں گی"

جوکھو" تو میں نہ کہونگا"

پیاری نے اسے پیچھے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا" کہوگے کیسے نہیں۔ میں کہلا کر چھوڑوں گی"

جوکھو" اچھا تو سنو! میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو۔ ایسی ہی لجانیوالی ہو۔ ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو۔ ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو۔ ایسی ہی کفایت شعار ہو۔ ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی عورت ملیگی تو بیاہ کرونگا۔ نہیں تو اسی طرح پڑا رہونگا"

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کر بولی" تم بڑے دل لگی باز ہو۔ ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ گئے"

نئی بیوی

ہمارا جسم پرانا ہے، لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے۔ اسی نئے خون پر زندگی قائم ہے۔ دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیا پن اس کے ایک ایک ذرہ میں ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرہ میں تاروں میں چھپے ہوئے نغمہ کی طرح گونجتا رہتا ہے۔ اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگامل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی از سر نو عود کر آئی ہے۔ جب پہلی بیوی بقید حیات تھی تو وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک تو پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے پھر کھانا کھا کر دوکان چلے جاتے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سو جاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آجایا کرو تو بگڑ جاتے۔ تمہارے لئے کیا دوکان بند کر دوں یا روزگار چھوڑ دوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ ایک لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوش کر لیا جائے۔ آج کل لکشمی کی چوکھٹ پہ ماتھا رگڑنا پڑتا ہے، تب بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔ لیلا بیچاری خاموش ہو جاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے، لیلا کو زور کا بخار تھا۔ لالہ جی دوکان پر چلنے لگے تو لیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا — "دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے ذرا سویرے آجانا۔"

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے — "اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمہارا جی اچھا ہو جائے تو میں دوکان نہ جاؤنگا۔"

لیلا رنجیدہ ہوکر بولی۔ "میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دوکان نہ جاؤ، میں تو ذرا سویرے آجانے کو کہتی ہوں"!

"تو کیا میں دوکان پر بیٹھا موج کرتا ہوں؟"

لیلا کچھ نہ بولی۔ شوہر کی یہ بے اعتنائی اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی، ادھر کئی سال سے اُسے اس کا دل دوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ کس کی جوانی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ لازم تو یہ تھا کہ پچیس سال کی رفاقت اب ایک گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہو جاتی جو ظاہر سے بے نیاز رہتی ہے، جو عیب کو بھی حسن دیکھنے لگتی ہے، جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں، زیادہ خوشنما ہو جاتی ہے۔ لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو، نہ بچے، تو اس کے لئے گئوشالہ سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔ ان کے خیال میں لیلا کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بنی رہے، آرام سے کھائے پہنے اور پڑی رہے۔ اسے اختیار ہے چاہے جتنے زیور بنوائے چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے، روزے رکھے، صرف ان سے دُور رہے۔ فطرت انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دلجوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے، خود اسی کے لئے ابلہانہ سرگرمی سے متلاشی رہتے تھے۔ لیلا چالیس سال کی ہوکر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی، مگر وہ پینتالیس سال کے ہوکر ابھی جوان تھے۔ جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بیقرار۔ لیلا سے اب انھیں ایک طرح کی کراہیت ہوتی تھی، اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرتناک احساس کی وجہ سے فطری بے رحمیوں کے ازالے کے لئے رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بوالہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے۔ وجہ نوحش! بات

لڑکوں کی توماں ہوگئیں، بال کھچڑی ہوگئے، چہرہ ڈھلے ہوئے فلالین کی طرح پرشکن ہوگیا، مگر آپ کو ابھی مہاور اور سیندور، مہندی اور ابٹن کی ہوس باقی ہے۔ عورتوں کی بھی کیا فطرت ہے! نہ جانے کیوں آرائش پر اسقدر رجحان دیتی ہیں۔ پوچھو اب تمھیں اور کیا چاہیئے؟ کیوں نہیں دل کو سمجھا لیتیں کہ جوانی رخصت ہوگئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جاسکتا، لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ ان کی طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوئی تھی۔ جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہفتے میں دو بار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدودوں کے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔

لیلا نے انھیں کشش و پیچ کی حالت میں کھڑے دیکھ کر مایوسانہ انداز سے کہا۔ "کچھ بتلا سکتے ہو کے بجے آؤ گے؟"

لالہ جی نے ملایم لہجے میں کہا۔ "تمہاری طبیعت آج کیسی ہے؟"

لیلا کیا جواب دے؟ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے تو شاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں، اگر کہتی ہے، اچھی ہے، تو شاید بے فکر ہوکر دو بجے رات کی خبر لائیں۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ کچھ بھاری ہو رہی ہے۔ لیکن تم جاؤ۔ دوکان پر لوگ تمہارے منتظر ہوں گے۔ مگر ایشور کے لئے ایک دو نہ بجا دینا۔ لڑکے سو جاتے ہیں، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، طبیعت گھبراتی ہے۔"

سیٹھ جی نے لہجہ میں محبت کی چاشنی دے کر کہا۔ "بارہ بجے تک آجاؤں گا ضرور۔"

لیلا کا چہرہ اتر گیا۔ "دس بجے تک نہیں آسکتے؟"

"ساڑھے گیارہ سے پہلے کسی طرح نہیں!"

"ساڑھے دس بھی نہیں؟"
"اچھا گیارہ بجے"
گیارہ پر مصالحت ہوگئی، لالہ جی وعدہ کرکے چلے گئے لیکن شام کو ایک دوست نے مجرا سننے کی دعوت دی۔ اب بچارے اس دعوت کو کیسے رد کر دیتے جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کر دیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں، آپ سے کسی طرح کی رعایت کا خواستگار نہیں محض دوستانہ بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہوتی ہے، ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہے، کبھی مہمان آئے ہیں، کبھی پوجا ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ، اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع کر لینے پڑینگے، اسے شاید ہی گھر سے کبھی فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے۔ آتے ہی اپنے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر دیں، لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ کی گنجائش کسی طرح نہ نکال سکے۔ دو کو ایک تو کہہ سکتے ہیں، گھڑی کی تیزی کے سر الزام رکھا جا سکتا ہے، لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے چپکے سے آکر نوکر کو جگایا، کھانا کھا کر آئے تھے، اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی، ہر لمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب سو گئی تھی۔ اسے جگانا سوئے ہوئے فتنے کو جگانا تھا۔
غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہوسکی۔ لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا۔ دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے۔ کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والی کی قصیدہ خوانی

کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام سے لڑکیوں کے لئے پانچ وظیفے قایم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ نہیں مریں صاحب! میں مر گیا، زندگی کی شمع ہدایت گُل ہو گئی اب تو جینا اور رونا ہے۔ میں تو ایک حقیر انسان تھا، نہ جانے کس کار خیر کے صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہِ ایزدی سے عطا ہوئی تھی، میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزلت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگامل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کر لی۔ آخر غریب کیا کرتے، زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی، اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہو گئی تھی۔ لکڑی کی ضرورت تو جبھی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی،

(۲)

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ دوکان سے اب انھیں اس قدر انہماک نہیں ہے، متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت جو ان میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی اب یہ ترشح پاکر پھر سر سبز ہو گئی ہے۔ اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں، موٹر نیا آ گیا ہے، کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کر دئیے گئے ہیں، نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہو گیا ہے، ریڈیو بھی لگا دیا گیا ہے۔ لالہ جی کی بوڑھی جوانی جوانوں کی جوانی سے بھی زیادہ پُر جوش اور ولولہ انگیز ہو رہی ہے۔ اسی طرح جیسے بجلی کی روشنی چاندنی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے،

لالہ جی کو ان کے احباب ان کی اس جواں طبعی پر مبارکباد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز سے کہتے ہیں، بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔ مجھ بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منہ پر سیاہی لگا کر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہر بدر کر دوں، جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں، جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے، روپے کا ایمانداری سے، حسن کا آرائش سے۔ آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں۔ ارے صاحب! میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے ایک گھنٹے سے نہ تبدیل کروں معلوم ہوتا ہے، زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں، کوئی شوق ہی نہیں، زندگی کیا ہے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔ یہی الفاظ، وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشا دیوی کے لوح دل پر بھی نقش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ہمیشہ سینما، تھیٹر، سیر دریا کے لئے اصرار کرتے ہیں لیکن آشا نہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی، وہ جاتی تو ہے مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آکر کہا "چلو آج بجرے پر دریا کی سیر کر آئیں"۔

بارش کے ایام تھے، دریا چڑھا ہوا تھا، ابر کی قطاریں بین الاقوامی نوجوانوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں، سڑک پر لوگ ملار اور بارہ ماسے گاتے چلے جا رہے تھے، باغوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔

آشا نے بیدلی سے کہا "میرا تو جی نہیں چاہتا"۔

لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا "تمہاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی"۔

"آپ جائیں، مجھے اور کئی کام کرنے ہیں"۔

"کام کرنے کو ایشور نے آدمی دیدئیے ہیں، تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا، آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اُٹھ جائیں گے"۔
لیلا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لئے انواع و اقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی۔ کسی سے سُن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذت زبان رہجاتی ہے۔ لالہ جی کے دل کی کلی کھل گئی، آشا کو اُن سے کسقدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کر رہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار۔ پیچھا چھوڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے۔ خواہ مخواہ سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا مزہ کرکرا کر دیتی تھی۔

بولے۔ "تمہاری بھی عجیب طبیعت ہے۔ اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو ایسا کیا طوفان آجائے گا! تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہو گی تو مجھے بالکل آرام طلب بنا دو گی۔ اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤنگا"۔

آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا — "آپ بھی تو مجھے ادھر اُدھر گھما کر میرا مزاج بگاڑے دیتے ہیں۔ یہ عادت پڑ جائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟"

لالہ جی نے فیاضانہ لہجہ میں کہا: "مجھے گھر کے دھندوں کی ذرہ برابر پرواہ نہیں ہے۔ بال کی نوک برابر بھی نہیں میں چاہتا ہوں کہ تمہارا مزاج بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو، اور تم مجھے بار بار "آپ" کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے "تم" کہو "تو" کہو محبت کی گالیاں دو، غصے کی صلواتیں سناؤ، لیکن تم مجھے آپ کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہو، میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں شوہر بیر چھو کر ابن کر رہنا چاہتا ہوں"۔

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا — "اے نوج! بھلا میں آپکو تم کہونگی، تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے یا بڑوں کو؟"

نیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پُرملال خبر سنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا آشا کے ان بھولے بھالے الفاظ سے ہوا۔ ان کا سارا جوش سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا، جیسے برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ سر پر بانکی رکھی ہوئی رنگین پھولدار ٹوپی، گلے میں پڑی ہوئی جوگئے رنگ کی ریشمی چادر، وہ تن زیب کا بیلدار کرتہ جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے، یہ سارا ٹھاٹ جیسے انھیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا! جیسے سارا نشہ کسی منتر سے اتر گیا ہو۔

دل شکستہ ہو کر بولے۔ "تو تمھیں چلنا ہے یا نہیں؟"

"میرا جی نہیں چاہتا!"

"تو میں بھی نہ جاؤں؟"

"میں آپ کو کب منع کرتی ہوں!"

"پھر آپ کہا!"

آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر کہا "تم" اور اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا!

"ہاں اسی طرح تم کہا کرو، تو تم نہیں چل رہی ہو، اگر میں کہوں کہ تمھیں چلنا پڑے گا، تب؟"

"تب چلونگی۔ آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے!"

لالہ جی حکم نہ دے سکے، فرض اور حکم جیسے الفاظ سے ان کے کانوں میں اِتش سا ہونے لگا۔ کھسیائے ہوکر باہر چلے، اُس وقت آشا کو ان پر رحم آگیا۔ بولی۔ "تو کب تک لوٹو گے؟"

"میں نہیں جا رہا ہوں!"

"اچھا تو میں بھی چلتی ہوں!"

جس طرح کوئی ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پاکر اُسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اسی طرح لالہ جی نے رونامنہ بناکر کہا: "تمہارا جی نہیں چاہتا تو نہ چلو، میں مجبور نہیں کرتا۔"

"آپ .... نہیں تم بُرا مان جاؤ گے۔"

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں، جو معمولی ساڑی پہنے ہوئے تھی، وہی پہنے چل کھڑی ہوئی۔ نہ کوئی نفیس ساڑی نہ کوئی مرصع زیور، نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجھلا اٹھتے تھے، شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور روشن کرنے کے لئے، اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اسقدر خشک اور افسردہ ہے، جیسے کوئی اوسر کا درخت ہو، کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ جڑاؤ زیوروں کے بھرے صندوق رکھے ہیں، کہاں کہاں سے منگوائے، دہلی سے کلکتہ سے فرانس سے کیسی کیسی بیش قیمت ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں، ایک نہیں سینکڑوں، مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لئے غریب خاندان کی لڑکیوں میں یہی عیب ہوتا ہے ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔ نہ کھا سکیں نہ پہن سکیں نہ دے سکیں، انھیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں!

دریا کی سیر تو ہوئی، مگر کچھ لطف نہ آیا۔

(۳)

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کرکے لالہ جی نے

سمجھ لیا کہ یہ محترم کی پیدائش ہے لیکن پھر بھی مشق برابر جاری رکھی۔ اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے۔ دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں، گراموفون اگر بگڑ گیا ہے، گاتا نہیں، یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی اسے اٹھا کر رکھ دینا یہ تو حماقت ہے۔

اُدھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر گھر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سترہ سال کا لڑکا آ گیا تھا کچھ عجیب مسخرا سا، بالکل اُجاڑ اور دیہاتی، کوئی بات ہی نہ سمجھتا، اس کے پُھلکے اقلیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہو جاتے، بیچ میں موٹے، کنارے پتلے، دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے، اور کبھی اتنی گاڑھی جیسے دہی۔ کبھی نمک اتنا کم کہ بالکل پھیکا، کبھی اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار۔ آشا سویرے ہی سے رسوئی میں پہنچ جاتی اور اس بدسلیقہ مہراج کو کھانا پکانا سکھاتی "تم کتنے نالائق آدمی ہو جنگل؟ آخر اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے یا بھاڑ جھونکتے رہے کہ پُھلکے تک نہیں بنا سکتے!"

جنگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا "بہو جی! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ سترھواں ہی سال تو ہے"۔

آشا ہنس پڑی "تو روٹیاں پکانا کیا دس بیس سال میں آتا ہے"؟

"آپ ایک مہینہ سکھا دیں بہو جی، پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پُھلکے کھلاتا ہوں کہ جی خوش ہو جائے جس دن مجھے پُھلکے بنانے آ جائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لونگا۔ سالن تو اب میں کچھ کچھ پکانے لگا ہوں نہ؟"

آشا حوصلہ افزا تبسم سے بولی "سالن نہیں وہ پکانا آتا ہے۔ ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا"۔

"میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں"؟
"اچھا! تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمہارا سالن لذیذ پکیگا"؟
"آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے"۔
"اور میں نہیں رہتی تب"؟
"تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے"!
"تمہارے دادا آجائیں گے تب تو تم چلے جاؤ گے"؟
"نہیں بہو جی، کسی اور کام میں لگا دیجئے گا، مجھے موٹر چلانا سکھوا دیجئے گا۔ نہیں نہیں آپ ہٹ جائیے میں پتیلی اتار لونگا۔ ایسی اچھی ساڑھی ہے آپ کی کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو"؟
"دور رہو، پھوہڑ تو تم ہو جی، کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلو گے"!
جگل افسردہ خاطر ہو گیا۔ نحیف چہرہ اور بھی خشک ہو گیا۔
آشا نے مسکرا کر پوچھا "کیوں! منہ کیوں لٹک گیا سرکار کا"؟
"آپ ڈانٹ دیتی ہیں بہو جی تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سیٹھ جی کتنا ہی گھڑکیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہو جاتا ہے"
آشا نے تشفی دی "میں نے تمھیں ڈانٹا نہیں۔ صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی تمہارے پاؤں پر گر پڑے تو کیا ہو"؟
"ہاتھ ہی تو آپ کا بھی ہے۔ کہیں آپ کے ہاتھ سے ہی چھوٹ پڑے تب"
سیٹھ جی نے رسوئی کے دروازے پر آ کر کہا "آشا ذرا یہاں آنا۔ دیکھو تمھارے لئے کتنے خوشنما گملے لایا ہوں، تمھارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہوتی ہو، لونڈے سے کہدو کہ مہراج کو بلا لائے، ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کر لونگا۔ مہراجوں کی کمی نہیں ہے۔ آخر

کب تک کوئی رعایت کرے۔ اِس گدھے کو تو ذرا بھی تمیز نہ آئی، سنتا ہے جگل آج لکھ دے اپنے باپ کو۔" چوتھے پہ توا رکھا ہوا تھا۔ آشا روٹیاں بیل رہی تھی جگل توے کے لئے روٹیوں کا انتظار کر رہا ہے ایسی حالت میں بھلا وہ کیسے گملے دیکھنے جاتی؟ کہنے لگی۔"

ابھی آتی ہوں ذرا روٹی بیل رہی ہوں، چھوڑ دوں گی تو جگل ٹیڑھی میڑھی بیلے گا۔"

لالہ جی نے کچھ چڑھ کر کہا۔" اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائیگا۔"

آشا اَن سُنی کر کے بولی۔" دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا، نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم چل کر بتا دو گملے کہاں رکھے جائیں؟"

"کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آئی جاتی ہوں۔"

"نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو۔"

"تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔"

لالہ جی سناٹے میں آ گئے۔ آشا نے کبھی اتنی بے التفاتی سے انھیں جواب نہ دیا تھا۔ اور یہ محض بے التفاتی نہ تھی اسمیں ترشی بھی تھی، خفیف ہو کر چلے گئے۔ انھیں ایسا غصہ آ رہا تھا کہ اِن گملوں کو توڑ کر پھینک دیں اور سارے پودوں کو چولھے میں ڈال دیں۔

جگل نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا۔" آپ چلی جائیں بہو جی! سرکار ناراض ہونگے۔"

"بکو مت، جلد جلد روٹیاں سینکو، نہیں نکال دئے جاؤ گے، اور آج مجھ سے روپیے لے کر اپنے لئے کپڑے بنوالو۔ بھک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو۔ اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں، تمھیں نائی بھی نہیں جُڑتا۔"

"کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیا حساب دونگا؟"

"ارے بیوقوف! میں حساب میں نہیں دینے کو کہتی۔ مجھ سے لے جانا۔"

"آپ بنوائیں گی، تو اچھے کپڑے لونگا۔ مہین کھدر کا کرتہ، کھدر کی دھوتی ریشمی چادر، اچھا سا چپل۔"

آشا نے مٹھاس بھرے ہوئے تبسم سے کہا۔" اور اگر اپنے دام سے بنوانا پڑے تو؟"

"تب کپڑے بنواؤنگا ہی نہیں۔"

"بڑے چالاک ہو تم۔"

"آدمی اپنے گھر پر روکھی روٹی کھاکر سو رہتا ہے۔ لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔"

"یہ سب میں نہیں جانتی، ایک گاڑھے کا کرتہ بنوا لو اور ایک ٹوپی۔ حجامت کے لئے دو آنے پیسے لے لو۔"

"رہنے دیجئے میں نہیں لیتا۔ اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی، سڑیل کپڑے ہوئے تو جی جلیگا۔"

"تم بڑے خود غرض ہو، مفت کے کپڑے لوگے اور اعلیٰ درجہ کے!"

"جب یہاں سے جانے لگوں گا تو آپ مجھے اپنی ایک تصویر دے دیجیگا۔"

"میری تصویر لے کر کیا کروگے؟"

"اپنی کوٹھری میں لگا دونگا اور دیکھا کرونگا بس وہی ساڑھی پہن کر کھنچوانا جو کل پہنی تھی، اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو۔ مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے پاس تو بہت گہنے ہونگے، آپ پہنتی کیوں نہیں؟"

"تو تمہیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟"

"بہت!"

لالہ جی نے پھر آکر خفت آمیز لہجے میں کہا۔" ابھی تک تمھاری روٹیاں نہیں پکیں؟ گگل! اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں، تو میں تمھیں نکال دونگا!"

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے۔ اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جاکر گملوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آرہی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں بھی دلآویز شیرینی تھی، لالہ جی کی ساری خفت غائب ہوگئی۔ آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ بولی۔ "میں ان میں سے کوئی گملہ نہ جانے دوں گی۔ سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا۔ سب کتنے سندر پودے ہیں، واہ، ان کے ہندی نام بھی مجھے بتا دینا!"

لالہ جی نے چھیڑا۔ "سب لے کر کیا کرو گی، دس پانچ پسند کرلو۔ باقی میں باہر باغیچہ میں رکھوا دونگا!"

"جی نہیں میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی، سب یہیں رکھے جائیں گے!"

"بڑی حریص ہو تم!"

"حریص سہی، میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی!"

"دس پانچ تو دے دو، اتنی محنت سے لایا ہوں!"

"جی نہیں ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا!"

(۴)

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آگیا۔ اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے ضرور، ورنہ ان کے بار بار تقاضہ کرنے پر، منت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا۔ کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی وہ بھی بے دلی سے۔ آج ان زیوروں سے مرصع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی۔ اترائی جاتی

ہے۔ گویا کہتی ہے۔ دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ پہلے جو کلی تھی وہ آج کھل گئی ہے
لالہ صاحب پر گھڑوں کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہیں۔ ان کے احباب و اعزہ آکر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں، دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی پُر لطف ہے۔ جو انواع و اقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے، وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کر دیا ہے۔

انھوں نے تجویز کی "چلو کہیں سیر کر آئیں بڑی مزیدار ہوا چل رہی ہے"
آشا اسوقت کیسے جا سکتی ہے۔ ابھی اُسے رسوئی میں جانا ہے، وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے تک فرصت ملے گی، پھر گھر کے کام دھندے سر پر سوار ہو جائیں گے اسے کہاں فرصت ہے۔ پھر کل سے اس کے کلیجے میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے، رہ رہ کر درد اٹھ آتا ہے۔ ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچکر دل ہی دل میں پھول اٹھے۔ وہ گولیاں رنگ لا رہی ہیں، راج وید نے آخر کہا بھی تھا، "ذرا سوچ سمجھ کر ان کا استعمال کیجئے گا۔ کیوں نہ ہو۔ خاندانی وید ہے، اس کا باپ مہاراجہ بنارس کا معالج تھا، پُرانے مجرب نسخے ہیں اس کے پاس۔"

چہرے پر سراسیگی کا رنگ بھر کر پوچھا "تو رات ہی سے یہ درد ہو رہا ہے۔ تم نے مجھ سے کہا نہیں ورنہ وید جی سے کوئی دوا منگوا دیتا۔"

"میں نے سمجھا تھا آپ ہی آپ اچھا ہو جائیگا۔ مگر اب بڑھ رہا ہے۔"

"کہاں درد ہو رہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو، کچھ آماس تو نہیں ہے؟"

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی "یہی تمھاری شرارت مجھے اچھی نہیں لگتی، جاکر کوئی دوا لا دو۔"

سیٹھ جی اپنی جوانمردی کا یہ ڈھنڈورا پاکر اس سے کہیں زیادہ محظوظ ہوئے جتنا شاید رائے بہادری کا خطاب پاکر ہوتے۔ اپنے اس کارنمایاں کی داد لئے بغیر انھیں کیسے چین ہو سکتا تھا، جو لوگ ان کی شادی کے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے، انھیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہنچے اور بادلِ دردمند بولے "میں تو بھی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا بکل سے ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے، کچھ عقل کام نہیں کرتی کہتی ہیں ایسا درد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا"

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ بولے "ہوا لگ گئی ہوگی، اور کیا؟"

سیٹھ جی نے اُن سے اختلاف کیا "نہیں پنڈت جی، ہوا کا فساد نہیں ہے، کوئی اندرونی شکایت ہے، ابھی کم سن ہیں نہ؟ راج وید سے کوئی دوا لئے لیتا ہوں"

"میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائیگا"

"آپ بات نہیں سمجھتے ہی آپ میں نقص ہے"

"آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے مگر خیر دوا لاکر دیکھئے اور اپنے لئے بھی کوئی دوا لیتے آئیگا"

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے دوست لالہ بھاگ مل کے پاس پہنچے اور ان سے بھی قریب قریب انھیں الفاظ میں یہ پُر ملال خبر کہی۔ بھاگ مل بڑا مُنہ پھٹ تھا مُسکرا کر بولا "مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں "میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں، اور تمھیں مذاق سوجھتا ہے، ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، بھلا اس میں مذاق کی کیا بات ہے، وہ ہیں کم سن،

نازک اندام، آپ ٹھہرے آزمودہ کار، مرد میدان بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈوا دوں"

سیٹھ جی نے مثین صورت بنائی "میں تو بھی بڑی احتیاط کرتا ہوں، تمہارے سر کی قسم!"

"جی رہنے دیجئے، میرے سر کی قسم نہ کھائیے۔ میرے بھی بال بچے ہیں، گھر کا اکیلا آدمی ہوں کسی تو طرح دوا کا استعمال کیجئے"۔

"انھیں راج وید سے کوئی دوا لے لیتا ہوں"

"اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں آپ کے پاس ہے"

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا، شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آ گئی۔ سینہ جیسے کچھ فراخ ہو گیا۔ چلتے وقت ان کا پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگا۔ اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج ہو گئی۔ بشرہ سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی، راج وید جی نے یہ مژدہ جانفزا سنا تو بولے "میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجئے گا۔ آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی، ذرا مہینہ دو مہینہ ان کا استعمال کیجئے اور پرہیز کے ساتھ رہئے، پھر دیکھئے ان کا اعجاز، اب گولیاں بہت کم رہی ہیں، لوٹ مچی رہتی ہے لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور دقت طلب ہے کہ ایک بار ختم ہو جانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں بوٹیاں ہیں، کیلاش نیپال اور تبت سے منگانی پڑتی ہیں، اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں۔ کتنا لوہے کے چنے چبانا ہے...... آپ احتیاطاً ایک شیشی لیتے جائیے"

(۵)

جگا ہے نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کر کہا۔ "بس ہو جی! آپ

اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں، آج میں آپ کو چولھے کے پاس نہ آنے دونگا۔"
آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "کیوں آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا۔"

"آج کی بات دوسری ہے۔"

"ذرا سنوں کیا بات ہے؟"

"میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں کہو، میں ناراض نہ ہوں گی۔"

"آج آپ بہت سندر لگ رہی ہیں۔"

"اے ڈونگا مل نے سیکڑوں ہی بار آشا کے حسن و انداز کی تعریف کی تھی، مگر ان کی تعریف میں اسے تصنع کی بو آتی تھی، وہ الفاظ ان کے منہ سے کچھ اس طرح نکلتے تھے، جیسے کوئی ہیجڑا تلوار لے کر چلے۔ جگل کے ان الفاظ میں ایک کیفیت تھی، ایک سرور تھا، ایک ہیجان تھا، ایک اضطراب تھا۔ آشا کے سارے جسم میں رعشہ آگیا۔ آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

"تم مجھے نظر لگا دو گے۔ اس طرح کیوں گھورتے ہو؟"

"جب یہاں سے چلا جاؤنگا تب آپ کی بہت یاد آئے گی!"

"روٹی بنا کر تم کیا کیا کرتے ہو؟ دکھائی نہیں دیتے!"

"سرکار رہتے ہیں، اسی لئے نہیں آتا۔ پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے دیکھئے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں۔"

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کون تمہیں جواب دیتا ہے؟"

"سرکار ہی تو کہتے ہیں، تجھے نکال دونگا۔"

"اپنا کام کئے جاؤ، کوئی نہیں نکالے گا۔ اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے۔"

"سرکار ہیں بڑے گستہ ور۔"

"دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کئے دیتی ہوں۔"

"آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ خبردار زبان سنبھال کر باتیں کرو۔"

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا، وہ روشنی کی طرح اس کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جگل نے اسی بے بائی سے کہا "میری زبان کوئی بند کرلے۔ یہاں تو سب ہی کہتے ہیں، میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کردے تو میں تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں، یا تو خود زہر کھالوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں۔ پھانسی ہی تو ہوگی نا۔"

آشا مصنوعی غصے کو قائم نہ رکھ سکی، جگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت ضبط کرنے پر بھی درد دل باہر نکل ہی آیا۔ "قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"ایسی قسمت جائے جہنم میں۔"

"تمھاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی دیکھ لینا۔"

"تو میں بھی زہر کھالوں گا دیکھ لیجئے گا۔"

"کیوں؟ بڑھیا تمھیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کریگی تمھیں سیدھے راستے پر رکھے گی۔"

"یہ سب ماں کا کام ہے۔ بیوی جس کام کے لئے ہے اسی کے لئے ہے۔"

"آخر بیوی کس کام کے لئے ہے؟"

"آپ مالک ہیں، نہیں تو بتلا دیتا بیوی کس کام کے لئے ہے۔"

موٹر کی آواز آئی نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر

آگیا تھا، اُس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی "لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آجانا!"

گلی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہونگا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ کورٹ کی، نہ نیٹ کی، نہ بلے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی۔ گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں جب تک کم از کم ایک سو خرچ کیجئے کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے سکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیلیں کھلائیں، جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لئے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے۔ بیچارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ گلی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے، تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلی پھوٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلی کا داغ آج تک لگا ہوا ہے، تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں جو بلے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی

پسند ہے۔ مجھے گُلّی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے۔ اور بچپن کی یادوں میں گلی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصباح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا، اور گلی ڈنڈے بنانا، وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جھمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت اچھوت اور غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی جس میں امیرانہ چونچلوں کی غرور اور خود نمائی کی گنجائش ہی نہ تھی اُسی وقت بھولے گا جب ....

گھر والے بگڑ رہے ہیں۔ والد صاحب چوکے پر بیٹھے ہوئے روٹیوں پر اپنا غصہ اُتار رہے ہیں۔ امّاں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے نہ کھانے کا۔ گلی ہے تو ذرا سی لیکن اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دُبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ۔ گلی کیسی ہی ہو، اُس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اُس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا پر تھا ہمارے گلی کلب کا چمپئن۔ جس کی طرف وہ آجائے، اُس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اُسے دُور سے آتا دیکھ اس کا استقبال کرتے تھے اور اُسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا، میں پد رہا تھا۔ لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں۔ پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لئے وہ سب چالیں چلیں جو

ایسے موقع پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابلِ معافی ہیں لیکن گیا اپنا داؤں لئے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ مِنّت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا۔ "میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدا پا تو بڑے بہادر بن کر، پدانے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟"

"تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟"

"ہاں تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا۔"

"نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں؟"

"ہاں میرا داؤں دیئے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔"

"میں تمہارا غلام ہوں؟"

"ہاں تم میرے غلام ہو۔"

"میں گھر جاتا ہوں۔ دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟"

"گھر کیسے جاؤ گے کوئی دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے۔ داؤں لینگے۔"

"اچھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو۔"

"وہ تو پیٹ میں چلا گیا۔"

"نکالو پیٹ سے۔ تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟"

"امرود تم نے دیا۔ تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا۔"

"جب تک میرا امرود نہ دو گے میں داؤں نہ دونگا۔"

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اُسے امرود کھلایا ہوگا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض کے لیئے ہی دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اُسے

مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ رشوت دے کر تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں، وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائیگا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے۔ جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی تھی۔
گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "میرا داؤں دے کر جاؤ۔ امرود سمرود میں نہیں جانتا۔"
مجھے انصاف کا زور تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی۔ اُس نے اُس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اُسے دانت سے کاٹ لیا۔ اُس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔ گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر جا پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا، ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ یہ مجھے اُسوقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔
ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جدا ہو جانے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی سکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب

چہرے صاف تبلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچے میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے۔ تم خوش قسمت ہو۔ بھائی جاؤ۔ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی۔

بیس سال گذر گئے۔ میں نے انجینیری پاس کی۔ اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی بچپن کی اسقدر دلکش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی، اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے اُن مقامات کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں۔ لیکن اُس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا جہاں کھنڈر تھا، وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا ایک پرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ اگر اُس کے نام اور نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اُسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لئے بیقرار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اُس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں، تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمہاری یاد تازہ ہے۔

اچانک ایک کھلی جگہ میں میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا ایک لمحہ کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا۔ بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں۔ صاحبی ٹھاٹھ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں، جاکر ایک لڑکے سے پوچھا۔ "کیوں بیٹے یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟" ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کون گیا

گیا چمار ؟

میں نے یونہی کہا "ہاں ہاں وہی۔ گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو۔ شاید وہی ہو"

"ہاں ہے تو"

"ذرا اُسے بلا سکتے ہو؟"

لڑکا دوڑا ہوا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لئے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور سے ہی پہچان لیا۔ اُس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اُس کے گلے لپٹ جاؤں، مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا "کہو گیا مجھے پہچانتے ہو؟"

گیا نے جھک کر سلام کیا "ہاں مالک بھلا پہچانوں گا کیوں نہیں۔ آپ مزے میں رہے"

"بہت مزے میں۔ تم اپنی کہو؟"

"ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں"

"ماتا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں۔ کچھ خبر ہے؟"

"ماتا تو مر گیا۔ موہن اور درگا دونوں ڈاکئے ہو گئے ہیں۔ آپ؟"

"میں تو ضلع کا انجینیر ہوں"

"سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے"

"اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟"

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا "گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی"

"آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا، ہم پدیں گے۔ تمہارا ایک داؤں

ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو!"

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھہرا گنے کا دو دوراں میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ بیچارا جھنپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کچھ کم جھینپ نہ تھی۔ اسلئے نہیں کہ میں گیا کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا۔ بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشہ بنا لیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی اُس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا۔ لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دُور تنہائی میں جا کر کھیلیں۔ وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا۔ مزے سے کھیلیں گے۔ اور بچپن کی اُس مٹھائی کو خوب مزے سے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے۔ ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اُسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمھیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا!"

گیا جھینپتا ہوا بولا۔ "میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا۔ نہیں تو میری کیا گنتی!"

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا۔ "لیکن مجھے تو تمھاری یاد برابر آتی تھی۔ تمھارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا یاد ہے نا!"

گیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکپن تھا سرکار، اُس کی یاد نہ لاؤ!"

"واہ! وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمھارے اُس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب نہ عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی اُس میں کہ آج تک اُس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے!"

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا، جہاں آکر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑنے جاتے تھے، اور اُس کے جھومکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آرہی ہے۔ میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اور ایک شاخ کاٹ لایا۔ جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے راب میں گلی رکھ کر اچھالی، گلی گیا کے سامنے سے نکل گئی۔ اُس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلی اُس کے پیچھے جا کر گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ داہنے بائیں کہیں ہو، گلی اُس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی۔ جیسے گلیوں پر اُس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوکدار گلی سبھی اُس سے ہل جاتی تھیں۔ گویا اُس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے، جو گلیوں کو کھینچ لیتی ہو، لیکن آج گلی کو اُس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں پورا ہونے پر بھی ڈنڈا کھیلے جاتا تھا، حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہئے تھی گلی پر جب ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دُور پر گر پڑتی، تو میں لپک کر اُسے خود ہی اٹھا لاتا، اور دوبارہ ٹُل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا، مگر کچھ نہ بولتا تھا۔ گویا اُسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں۔ اُس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گلی اُس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آکر لگتی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُس کا کام تھا، ڈنڈے سے ٹکرا جانا لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں۔ کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں کبھی

آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد ایک بار گلی ڈنڈے میں آ گئی۔ میں نے دھاندلی کی۔ گلی ڈنڈے میں نہیں لگی۔ بالکل پاس سے گئی، لیکن لگی نہیں۔

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ "نہ لگی ہوگی۔"

"ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا۔"

"نہیں بھیا تم بھلا بے ایمانی کرو گے۔"

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اُسے کتنی آسانی سے دھوکا دئیے چلا جاتا تھا۔ گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا۔

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اُس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں۔ میرا حرج ہی کیا ہے۔ مان گیا تو واہ واہ ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑا لوں گا، پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "لگ گئی۔ لگ گئی۔ ٹن سے بولی۔"

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے لگتے دیکھا میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"ٹن سے بولی ہے سرکار۔"

"اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو۔"

میرے منہ سے یہ فقرہ اُس وقت کیسے نکل گیا۔ اس پر مجھے

خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ویسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا۔ ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا تھا۔ لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

"ہاں سرکار کسی اینٹ میں لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی"۔

میں نے پھر پدانا شروع کیا۔ لیکن اسقدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لئے جب تیسری دفعہ گلی ڈنڈے میں لگی۔ تو میں نے بڑی فراخدلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا۔"اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیا۔ کل پر رکھو"۔

میں نے سوچا۔ کل بہت سا وقت ہوگا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لئے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا۔"نہیں نہیں ابھی بہت اُجالا ہے۔ تم اپنا داؤں لے لو"۔

"گلی سوجھے گی نہیں"۔

"کچھ پرواہ نہیں"۔

گیا نے پدانا شروع کیا۔ لیکن اب اُسے بالکل مشق نہ تھی۔ اُس نے دو بار ٹِل لگانے کا ارادہ کیا۔ لیکن دونوں ہی بار چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا۔ بیچارہ گھنٹہ بھر پدا۔ لیکن ایک منٹ میں ہی اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا۔"ایک داؤں اور لے لو۔ تم تو پہلے ہی ہاتھ میں ہچ گئے"۔

"نہیں بھیا اب اندھیرا ہو گیا ہے"۔

"تمہاری مشق چھوٹ گئی۔ کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟"

"کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا"۔

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا "کل یہاں گلی ڈنڈا ہوگا۔ سبھی پرانے کھلاڑی کھیلینگے تم بھی آؤ گے جب تمھیں فرصت ہو سبھی کھلاڑیوں کو بلا لوں "

میں نے شام کا وقت دیا۔ اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے جنہیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر پر بیٹھا بیٹھا تماشہ دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اُس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ٹُل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی، آج اُس نے اُسے کمال کی معراج تک پہنچا یا تھا۔ کہیں کل اُس نے مجھے اس طرح پدا یا ہوتا تو میں ضرور رو دینے لگتا۔ اُس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدنے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا، گلی زمین سے لگ کر اچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا، مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آرہا تھا، جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا نے کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اُس نے مجھے رحم کے قابل سمجھا۔ میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کیں، اُسے ذرا بھی غصّہ نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی رکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا میں اب افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اُس کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں، لیکن اُسکا

ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا، تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پاکر اب میں اُس کے رحم کے قابل ہوں۔ وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہوگیا ہے۔ میں چھوٹا ہوگیا ہوں۔

سوانگ

(۱)

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا۔ اور نہ نام کے پیچھے "سنگھ" کی دُم لگا دینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانہ میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ادھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کے کوئی علامت نہ تھی۔ گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی راجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدر بزرگوار نے کپڑے کی دوکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی۔ اور گجندر سنگھ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ قد و قامت میں بھی فرق آ گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا۔ لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے، گورے چٹے، عینک باز، نازک بدن، فیشنیبل بابو تھے۔ انھیں علمی مشاغل سے دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہوگی۔ گجندر سنگھ کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اس خاندان میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہ ہوا تھا۔ ان کے خسر پنشنر صوبہ دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آ سکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی، ملازمت کی تلاش تھی، اس لئے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بلاوا آیا تو اس نے کوئی حیلہ حجت نہ کی۔ صوبہ دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں، یہ اسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبہ دار صاحب کی سفارش سے

نائب تحصیلداری میں نام زد ہو جائے۔ اِدھر شیام دُلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانہ سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا ریشمی کوٹ بنوایا۔ اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہنچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانۂ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو پٹخنی دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا کہ صوبہ دار صاحب دیو کی طرح آکر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے "ارے سنو۔ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انھیں لے جا کر ذرا جنگل کی سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وکار کھلاؤ۔ یہاں ٹھیٹھر دیٹھر تو ہے نہیں۔ ان کا جی گھبراتا ہوگا۔ وقت بھی اچھا ہے۔ شام تک لوٹ آؤ گے۔

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی۔ بیچارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ یہ دیہاتی اُجڈ لونڈے اُسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی تو راہِ فرار نہ پاکر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔ بولے میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں۔

صوبہ دار صاحب نے فرمایا۔ تم گھوڑے پر سوار ہو لینا یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چنّو جا کر بندوق لا۔ میں بھی چلوں گا۔ کئی دن سے باہر نہیں نکلا۔ میرا رائفل بھی لیتے آنا۔

چنّو اور مُنّو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجندر کی جان سوکھنے لگی پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جانتا کہ یہ بلا سر پڑنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑ رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا

سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری۔ دیہاتی گھوڑے یونہی تھان پر بندھے بندھے ٹرّے ہو جاتے ہیں، اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہنچے۔ گھوڑا بھی کھینچ کر آ گیا۔ صوبہ دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لئے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اُس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا، ہنہناتا تھا۔ اٹھی ہوئی گردن، لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی، بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجندر دل میں سہم اٹھا۔ مگر بہادری دکھانے کے لئے گھوڑے کے پاس جا کر اس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکا شہسوار ہے۔ اور بولا۔ جانور تو جاندار ہے مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں ایسا کچھ بہت تھکا نہیں ہوں میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ اس کی مجھے مشق ہے۔

صوبہ دار نے کہا۔ بیٹا جنگل دور ہے۔ تھک جاؤ گے۔ بڑا سیدھا جانور ہے بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔

گجندر نے کہا۔ جی نہیں۔ مجھے بھی یونہی چلنے دیجئے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں، آپ بزرگ ہیں سوار ہو جائیں۔

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دور کے بعد پتھریلا راستہ ملا۔ ایک طرف ہرا بھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ۔ دونوں ہی طرف ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبے دار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے

تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بار بار پچھڑ جاتا تھا، اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے سے تر، ہانپتا ہوا اپنی حماقت پر پچھتاتا چلا جاتا تھا۔ یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی شام دلاری مہینہ دو مہینے میں جاتی ہی مجھے اس وقت کتوں کی طرح دوڑتے آنے کی کیا ضرورت تھی، ابھی سے یہ حال ہے۔ شکار نظر آگیا تو معلوم کیا آفت آئے گی میل دو میل کی دوڑ تو ان کیلئے معمولی بات ہے۔ مگر یہاں تو کچومر ہی نکل جائے گا۔ شاید بے ہوش ہو کر گر پڑوں۔ پیر ابھی سے من من بھر کے ہو رہے ہیں۔

یکایک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے۔ اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چنتو نے پوچھا۔ کیا ہے جیجا جی۔ رک کیسے گئے؟

گجندر سنگھ نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا۔ کچھ نہیں اس درخت کا حسن دلآویز دیکھ کر دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ اہا! کیا بہار ہے۔ کیا رونق ہے، کیا شان ہے گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لئے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو یا رشیوں کی پاک روحیں سفر جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے چلئے مجھے اس آب حیات سے شاد کام ہونے دیجئے۔

دونوں نوجوان فرط حیرت سے گجندر کا منہ تاکنے لگے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ حضرت کہہ کیا رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے جنگلوں میں گھومنے والے، سیمل ان کے لئے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے کتنی ہی بار اس پر چڑھے تھے، اس کے نیچے دوڑے تھے، اس کے پھولوں کی گیند بنا کر کھیلے تھے ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی حسن پرستی ور کیا جانیں۔

صوبہ دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ اِن گوں کو ٹھہرا ہوا دیکھ کر لوٹ آئے اور بولے۔ "کیوں بیٹا ٹھہر کیوں گئے؟"

گجندر نے دست بستہ گذارش کی۔ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میری روح لغمۂ جنت کا مزہ لے رہی ہے۔ آہا! یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے۔ مجھ میں بھی وہی سرخی ہے، وہی حسن ہے، وہی لطافت ہے۔ میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں؟ جنگل کے معصوم جانوروں کا؟ ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں، یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں؟ نہیں۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں مجھے اس ہستی و بہار میں محو ہونے دیں، بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرت کا خزانہ ہے۔ اس کا خون نہ کیجئے۔ نظارہ ہائے قدرت سے چشم باطن کو مسرور کیجئے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں ایک ایک ہستی میں مسرت کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔ خوں ریزیوں سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجئے۔

اس تصوف آمیز تقریر نے سبھی کو متاثر کر دیا۔ صوبہ دار صاحب نے چنو سے آہستہ سے کہا۔ عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔ چنو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا ہے بُرا۔

صوبہ دار نے عارفانہ انداز سے کہا۔ ہاں بُرا تو ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔ جب ہر ایک چیز میں اُسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون۔ اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا۔

پھر وہ گجندر سے بولے۔ بھیّا تمہارے اپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں

قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے۔

گجندر پر ستا تہ کیفیت طاری تھی۔ اسی سرور کے عالم میں بولے ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا۔ انگنت جنگلی سُور، ہرن، تیندوے، نیل گائیں، مگر ہلاک کئے ہوں گے۔ ایک بار چیتے کو بار ڈالا تھا، مگر آج نئے عرفان کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہیں رہا۔

(۲)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی۔ آٹھ ہی بجے سے گاؤں کے عورت مرد، بوڑھے، بچے، گاتے بجاتے کبیریں اڑاتے ہولی کی طرف چلے۔ صوبہ دار صاحب بھی بال بچوں کو لئے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گاؤں کی ہولی نہ دیکھی تھی۔ اس کے شہر میں تو ہر محلے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کُندے جلا دئے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا آتشبازی چھوٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سبھی پٹاخے، چھچھوندریں، ہوائیاں چھوڑنے لگے۔ گجندر کے سر پر سے کئی چھچھوندریں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ ہر ایک پٹاخے پر بے چارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اُجڈ دیہاتیوں کو بد دعائیں دیتا تھا۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ بارود کہیں کپڑے میں لگ جائے، کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ان دہقانیوں کو کیا خبر۔ یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی۔

گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فٹ اونچے اچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے۔ دل دھک دھک کرنے لگا، گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔ فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لئے اور دس قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

چنو نے کہا۔ "چچا جی! آپ کیا چھوڑیں گے۔ کیا لاؤں؟"

منو بولا۔ ہوائیاں چھوڑیئے چچا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔

چنو۔ ہوائیاں بچے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے۔ آپ بم گولہ چھوڑیئے بھائی صاحب!

گجندر۔ بھئی مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں۔ مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی سے آتشبازی چھڑا رہے ہیں۔

منو۔ دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیئے۔

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ اُن کی سُرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کُرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں، مزے سے ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ گل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے۔ اور سب کی نگاہیں اُن کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ان کا فلسفی دماغ بھی خود نمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لے لی گو ایک شان بے نیازی کے ساتھ۔ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولا چھوٹا۔ آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکہ ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ساری فضا متلاطم ہوگئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل

شور مچاتی ہوئی بھاگیں، جانور رسیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ سرپٹ، اور سیدھے گھر پر آکر دم لیا۔ جنتو اور منّو دونوں گھبرا گئے۔ صوبہ دار صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ تینوں آدمی بگٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انھیں بھاگتے دیکھا تو سمجھے کوئی شدید واردات ہو گئی۔ سب کے سب ان کے پیچھے ہو لئے۔ گاؤں میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ مہمان کو ہو کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں؟

ایک لمحہ میں سینکڑوں آدمی صوبہ دار صاحب کے دروازہ پر پرسشِ حال کے لئے جمع ہو گئے۔ گاؤں کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابلِ زیارت اور بدحال ہوتے ہوئے بھی منظورِ نظر ہوتا ہے۔

صوبہ دار نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "تم وہاں سے کیوں بھاگ آئے بھیا؟"

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا۔ اور جواب بھی ایسا کہ گاؤں والوں پر اس کی ضمارسی کا سِکہ بٹھا دے۔

بولا۔ "کوئی خاص بات نہ تھی۔ دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔"

"نہیں کوئی بات ضرور تھی۔"

"آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اُسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"جب تک بتلا نہ دو گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی۔ سارا گاؤں گھبرایا ہوا ہے۔"

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا۔ آنکھیں بند کر لیں، جمہائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بات یہ ہے کہ جونہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا میں نے کبھی آتشبازیاں نہیں چھوڑیں ہمیشہ اس کی مذمت کرتا رہا ہوں، آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری رُوح مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہو گئی، اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں میں آپ کے جشن میں نہ شریک ہو سکوں گا۔"

صوبہ دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا وہاں کوئی اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "آ گئی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں۔ تم بھلا کیا سمجھو گے۔ ہم بھی کچھ کچھ ہی سمجھتے ہیں۔"

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی، مگر آتشبازیاں دریا میں ڈال دی گئیں شریر لڑکوں نے کچھ اس لیے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھڑائیں گے۔

شیام دُلاری نے تخلیہ میں کہا "تم تو وہاں سے خوب بھاگے۔"

گجندر اکڑ کر بولے "بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔"

"میری تو جان نکل گئی کہ نہ معلوم کیا ہو گیا۔ تمہارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ٹوکری بھر آتشبازی پانی میں پھینک دی گئیں۔"

"یہ تو روپے کو آگ میں پھونکنا ہے۔"

"ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لئے تو آتے ہیں۔"

"تیوہار میں گاؤ بجاؤ۔ اچھی اچھی چیزیں پکاؤ کھاؤ۔ خیرات کرو۔ عزیزوں سے ملو۔ سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اُڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔"

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازے پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا۔ یہ دھکا کس نے مارا؟

شیاما نے لاپروائی سے کہا۔ "بلّی ہوگی۔"

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیواڑ پر دھکا لگا۔ گجندر کو لرزہ آگیا۔ لالٹین لے کر دراز سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ چار پانچ آدمی کرتے پہنے، پگڑیاں باندھے، داڑھیاں لگائے، شانے پر بندوقیں رکھے کیواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

"دونوں سو گئے ہیں۔ کواڑ توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے۔"

"اور اگر دونوں جاگ گئے؟"

"عورت کیا کر سکتی ہے۔ مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔"

"سنتے ہیں گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے۔"

"کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے۔"

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دلاری سے بولے یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔"

"چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے، نہیں میں پکارتی ہوں۔ چور کا دل آدھا۔"

"نا نا، کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ محلے میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ گھر کے آدمی کیا ہوئے؟"

"بھیّا اور منّو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پہ پڑے ہوں گے۔ اُن کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔"

"اس کمرے میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہنچے مکان ہیں یا قید خانے۔"

"میں تو چلاتی ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چُپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کرلیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لیجانا ہو لے جائیں۔ جان تو بچے۔ دیکھو کواڑ ہل رہے ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں یا ایشور، کہاں جاؤں۔ اس مصیبت میں تمھارا ہی بھروسا ہے۔ کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں آتا ہی کیوں۔ بس چپ ہی سادھ لو۔ اگر پلائیں لائیں تو بھی سانس مت لینا۔"

"مجھ سے تو چُپ سادھ کر پڑا نہ رہا جائے گا۔"

"زیور اتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تولیں گے۔"

"زیور تو نہ اتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"کیوں جان دینے پہ تُلی ہوئی ہو؟"

"خوشی سے تو زیور نہ اُتاروں گی۔ زبردستی کی اور بات ہے۔"

"خاموش۔ سُنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

باہر سے آواز آئی "کواڑ کھول دو۔ نہیں تو ہم کواڑ توڑ کر اندر آجائیں گے۔"

گجندر نے شیام دُلاری کی منّت کی "میری بات مالو شیاما۔ زیور اتار کر رکھ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا۔"

باہر سے آواز آئی۔ "کیوں شامتیں آئی ہیں۔ بس ایک منٹ کی مُہلت

اور دیتے ہیں۔ اگر کواڑ نہ کھولے تو خیریت نہیں۔"
گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا۔ کھول دوں؟
"وہاں بلا لو۔ تمھارے بھائی بند ہیں نہ۔ وہ دروازے کو باہر سے دھکیلتے ہیں۔ تم اندر سے باہر کو ٹھیلو۔"
"اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے؟ پانچ پانچ جوان ہیں۔"
"وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے، لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"
"تم پاگل ہو گئی ہو۔"
"چنٹو دادا ہوتے تو پانچوں کو گراتے۔"
"میں لٹھ باز نہیں ہوں۔"
"تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سبھوں سے سمجھ لوں گی۔"
"تمھیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے، ماتھے میرے جائے گی۔"
"میں تو چلاتی ہوں۔"
"تم میری جان لے کر چھوڑو گی۔"
"مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتی ہوں۔"
اُس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھربھرا کر گھس آئے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں۔ تم عورت کے سارے گہنے اتار لو۔
دوسرا بولا۔" اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔ ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی۔"
تیسرا۔"یار عورت تو حسین ہے۔"
چوتھا۔"سنتی ہے او مہریا۔ زیور دیدے نہیں گلا گھونٹ دونگا۔"

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اُتار دیتی۔
شیام دلاری نے کہا "گلا گھونٹ دو چاہے گولی ماردو۔ زیور نہ اتارونگی"
پہلا "اسے اُٹھالے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے"
دوسرا "بس یہی مناسب ہے۔ کیوں رے چھوکری ہمارے ساتھ چلے گی؟"
شیام دلاری "تمہارے مُنہ میں کالکھ لگادوں گی"
تیسرا "نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جاکر بیچ ڈالیں گے"
شیام "ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوادوں گی"
چوتھا "کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی۔ ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے گذرے ہیں۔ کیا رہ جائیگا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھالے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا"
پانچواں "یا تو سارے زیور اتار کر دیدے۔ یا ہمارے ساتھ چل"
شیام دلاری "کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال اُدھیڑ ڈالیں گے"
پہلا "یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اُٹھالے چلو۔ تب آپ ہی پیروں پڑے گی"
دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ گجندر بے حس وحرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے۔ ہائے! کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک تو پوچھوں نہیں۔
جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اُٹھالیا اور لے کر آنگن میں جا پہنچے تو شیام

دلاری دروازے پر کھڑی ہو کر بولی۔"انھیں چھوڑ دو تو میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

پہلا۔"پہلے ہی کیوں نہ راضی ہو گئی تھی۔ چلے گی نہ؟"

شیام دلاری۔"چلوں گی، کہتی تو ہوں۔"

تیسرا۔"اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں۔"

دونوں چوروں نے گجندر کو لا کر چارپائی لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا۔ صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبہ دار صاحب کو جگائیں۔ منہ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کے کمرے میں آئیں۔ گجندر کا وہاں پتہ نہ تھا۔

ایک"کہاں چلے گئے؟"

شیام دلاری"باہر چلے گئے ہوں گے۔"

دوسری"بہت شرمندہ ہوں گے۔"

تیسری"مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہو گئی تھی۔"

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی۔ سمجھے شاید گھر میں جاگ ہو گئی۔ لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے۔

"ذرا دیکھئے شیاما کہاں ہے۔ میری تو نیند ہی نہ کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔"

یکایک انھیں عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ

حیرت میں آ گئے۔

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا۔

ایک نے کہا۔ "واہ جیجا جی۔ دیکھ لی آپ کی بہادری۔"

شیام دُلاری۔ "تم سب کی سب شیطان ہو۔"

تیسری۔ "بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی، اور آپ نے سانس تک نہ لی۔"

گجندر سمجھ گئے۔ بڑا دھوکہ کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنالی۔ بولے۔ "تو کیا کرتا، تمھارا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر مونچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔"

سب کی سب گجندر کا مُنہ دیکھتی رہ گئیں۔

انصاف کی پولیس

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا۔ اور وہی تحریر دیکھی، تو اُن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہوئے ہاتھ اور دل دونوں کانپنے لگے۔ خط میں کیا ہے یہ اُنہوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا۔ اِسی لفافے اور اِسی تحریر کے کئی خط یکے بعد دیگرے انھیں مل چکے تھے۔ اس خط کا بھی وہی مضمون ہو گا انہیں مطلق شبہ نہ تھا وہ خط کو کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لئے ہوئے آسمان کی طرف تاکنے لگے۔ گویا اس میں اپنا نوشتہ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ دل کے مضبوط آدمی تھے۔ مُردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے۔ رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں اُنھیں چھو بھی نہیں گئی تھیں، ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے وہ ہر پورنماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ پچھلے پندرہ سال میں اِس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے۔ روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیو جی کو جل چڑھاتے تھے۔ مہینے میں دو بار برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا، ایک دھرم سالہ بنوانے کی فکر میں تھے۔ زمین طے کر لی تھی۔ اور کسی اچھے مہورت کے منتظر تھے۔ انہوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا کہ اس کارِ خیر میں اُن کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہ خرچ ہو گی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی جس پر انہوں نے پہلے اپنی گائے بھینسوں کے لئے ایک مختصر سا چھپر ڈال لیا تھا۔ اور جب بیوہ ایک نابالغ لڑکا چھوڑ کر مر گئی، تو وقف زمین اُن کے قبضہ میں آ گئی۔ لڑکا اپنے ننہیال میں تھا۔ اور ننہیال والوں کو نہ

توفیق تھی نہ اتنی فرصت۔ کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے۔ معمار سب ان کے اسامی تھے۔ اور مزدوری کر کے سودا ادا کرنا چاہتے تھے اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے کچھ قرض لے گیا تھا۔ اور اصل کی دوچند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اُس پر اِن کے ہزاروں روپے نکلتے تھے۔ اِس لئے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا، وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھالے بس دھرم سالہ تیار ہے۔ ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر اُن کا پکا اعتقاد تھا جن کی دعا اور برکت سے انھیں کبھی کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا۔ مگر جب سے یہ خطوط ملنے لگے تھے، انہیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو اُن کے دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا ہے۔ اگر دس پانچ مسلح آدمی آجائیں، تو وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے۔ شاید انھیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ ہمسائیوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا، جو خطرے کے وقت کام آئے، حالانکہ سبھی انکے اسامی تھے یا رہ چکے تھے لیکن یہ فرقہ احسان فراموشوں کا ہے جس کے دروازے پر ضرورت کے وقت ناک اور پیشانی رگڑتا ہے، اُسی کے درپئے آزار ہو جاتا ہے۔ احسان ماننا تو دُور رہا اُلٹا اور بدخواہ ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے سوچا۔ اگر رات کو دس پانچ آدمی آجائیں تو واقعی بڑی مشکل کا سامنا ہو۔ بے شک دروازہ مضبوط ہے، اور اسے توڑنا آسان نہیں۔ جوڑیاں بھی جرمن ساخت کی ہیں، جن پر کوئی حربہ اثر ہی نہیں کر سکتا۔ اور دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا، نقب تو امرِ محال ہے۔ بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے۔ ایک ایک پتھر دس دس من کا ہے۔

اِس خیال سے انھیں قدرے تشفی ہوئی۔ اپنی رائفل نکال کر انہوں نے

اسکا خوب معائنہ کیا۔ موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں۔ پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ کون جانے یہ چوکیدار بھی انہی میں مل گیا ہو۔ خدمتگار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کے سانپ ہو سکتے ہیں۔

آخر کئی منٹ کے روحانی انتشار کے بعد انہوں نے خط کھولا، اور ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سانس تیز چلنے لگی۔ فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اور خط لئے اندر آ کر کیسر سے بولے:۔

"دیکھتی ہو۔ آج پھر وہی خط آیا۔ آج تو تاریخ بھی مقرر کر دی۔ پرسوں اُن کا دھاوا ہو گا۔ لکھا ہے، اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد امیشور کے مندر کے سامنے درخت کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو۔ یہ سب سمجھتے ہونگے کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈر جاؤنگا۔"

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی۔ پھر بھی اُس نے اِن کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اُس پہ ایک نظر ڈال کر بولی:۔

"میں تو سوچتی ہوں مہینہ دو مہینے کے لئے یہاں سے کہیں چلے چلیں کاشی، پریاگ، ہردوار کہیں بھی۔ تیرتھ کا تیرتھ ہو جائیگا اور ذرا چین بھی نصیب ہوگا۔ مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی"

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے:۔

"اس طرح اگر ایک ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا۔ یہ سب میرے ہی اسامی ہیں جن کی جائیدادیں میں نے نیلام کرائی ہیں۔ رائفل کی ایک آواز جہاں کی، ہرہو جائیں گے۔ پولیس کو بھی اطلاع کئے دیتا ہوں میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی۔ وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیں گے

اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کر لیں گے۔ اور حفاظت جیسی وہ کریں گے وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن اب اطلاع دیدونگا۔ دو پیا۔ سو روپیوں کا مُنہ نہ دیکھونگا۔ اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے۔"

کیسر دوسرے بدن کی عورت تھی۔ نخلِ بے ثمر جو بیت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے۔ اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصہ گذار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پُر خوف مایوسی طاری رہتی تھی۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں پھر یہ زر و مال کس کے ہاتھ لگے گا۔ سب سے زیادہ خوف اُسے بیماری کا تھا۔ اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی اور اس جامۂ ہستی کو اس وقت تک اُتارنا نہ چاہتی تھی، جب تک کہ ایک تار بھی باقی رہے بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی۔ موت کو بُلاتی، لیکن اب تو اس کی زندگی تن اُسکا خاتمہ تھا۔ پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے۔ اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا۔ اُسے وہ دواؤں اور دعاؤں سے دُور کرتی رہتی تھی، اور گویا تقدیر پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لیئے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تھے اس کا خوف بھوت کی طرح اُس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ منت آمیز لہجہ میں بولی:-

"پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میری بات مانو یہاں سے بھاگ چلو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے۔ کیا کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ چور کوئی گھر کو تو اُٹھا نہ لے جائے گا۔"

سیٹھ جی نے کیسر کی بدحواسی پر ترس کھا کر کہا:-

"تم ناحق اتنا ڈرتی ہو کیسر! پولیس کو جب ضابطہ کے ساتھ اطلاع دی جائیگی تو اُس کا فرض ہو جائیگا کہ ہماری حفاظت کرے۔ ہم پانچ ہزار

سالانہ ٹیکس دیتے ہیں۔ اگر پولیس نے سماعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہونگا جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اُس کا قانونی فرض ہے۔"

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آتا۔ وہ تو کسی طرح اُس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی۔ جو اُس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ پولیس کا اُسے اب تک جو تجربہ تھا، اُس کے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی۔ بولی:۔

"پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے، جب واردات ہو جاتی ہے، تب البتہ شان جتانے کے لئے آ پہنچتے ہیں۔ یہ مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہو جانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔"

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی۔ "پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں۔ تم کیا جانو۔"

کیسر نے بھی اُسی لہجہ میں جواب دیا۔ "اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے، تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہو جائے گی۔ لوٹ کے مال میں ان کا ساجھا ہوتا ہے۔"

"جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں، اور روز دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں دیتے۔ اس پر دارو غہ جی کو برابر پاٹھا اچار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے تو میں نے کتنی رسد پہنچائی تھی۔ ایک کنستر گھی اور ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی یہ سب کھلانا پلانا کس دن کام آئے گا۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ آدمی کو بالکل دوسروں کے بھروسے نہ بیٹھا رہنا چاہیے۔ اپنے قوت بازو سے بھی کام لینا چاہیے۔ میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہی ہے۔ آؤ تمہیں بھی بندوق چلانا سکھا دوں۔"

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی۔ کیسر ہنس کر بولی :۔
"ہاں اور کیا۔ اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی۔ تم کو جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے"۔
سیٹھ جی نے کہا "اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آجکل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں۔ سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں۔ بندوق چلاتی ہیں"۔
کیسر نے اعتراض کیا " ولایت کی عورتیں چلاتی ہوں گی۔ یہاں کی عورتیں کیا چلائیں گی۔ ہاں انگل بھر کی زبان چاہے چلالیں"۔
سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصیح کی " اب یہاں کی عورتیں بھی چلاتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہم تم دونوں بندوق لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کر سکیں گے۔ عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہو جاتی ہے"۔
کیسر نے آخری فیصلہ کیا "نا بابا۔ میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی"۔
اس وقت چوکیدار نے آکر کہا " داروغہ جی نے کئی کانسٹبل بھیجے ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں"۔

(۳)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹبلوں نے انھیں ادب سے سلام کیا۔ اور ان میں سے ایک نے کہا "ہمیں داروغہ جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آرہی ہیں۔ آج کل باہر سے بہت سے ڈاکو اس علاقے میں آگئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں"۔

سیٹھ جی نے کانسٹبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا "داروغہ جی کو کیسے معلوم ہوگیا میرے پاس تو ایسے کئی خط آچکے ہیں۔ ایک آج بھی آیا ہے۔ میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آرہا تھا۔"

ہیڈ کانسٹبل نے جواب دیا "حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ جی کو کیسے معلوم ہوگیا۔ علاقہ کے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو بھلا کوئی بات ہے۔ حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ حضور پانچ ہزار روپے سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہوتے مجال ہے، کہ آپ کا بال بھی بیکا ہو جائے۔ آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ تھانہ کے باہر ان سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ داروغہ جی نے سوچا تھا گارد منگوالیں گے۔ مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل یہاں سے دو سو کوس پر پہنچ گئے۔ گارد منگا کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ رعایا کی تو ہمیں فکر نہیں کس کے پاس اتنا مال اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو۔ اور اگر کسی کے پاس دو چار سو روپے نکل ہی آئے تو اس کے لئے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جان ہتھیلی پر لئے نہ پھرے گی۔ ڈاکوؤں پر کوئی ذمّہ داری نہیں وہ تو بے دریغ گولی چلاتے ہیں، اور اکثر چھپ کر ہمارے لئے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں۔ کوئی بات بگڑ جائے تو الٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے۔ اس لئے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، کہ آپ کو جس مال و اسباب کے بارے میں خطرہ ہو، اسے لاکر تھانہ کے خزانہ میں جمع کر دیجئے۔ آپ کو رسید دے دی جائے گی۔ آپ کا قفل لگا دیا جائے گا صندوقوں پر آپ اپنی مہر لگا دیجئے گا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے تو آپ اپنی چیزیں واپس

لے لیجیگا۔ اس کے لئے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے، کہ جو لوگ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔ ورنہ سخت جواب طلب کیا جائیگا۔ ورنہ اپ جانتے ہیں، پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی۔ اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائے گی، اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی، ہمارے اوپر بھی جواب دہی آجائے۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال و اسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے، خون بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس لئے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ آپ آج ہی خطرے والی سب چیزیں لے کر تھانہ میں تشریف لے آئیں۔ اور انھیں خزانے میں داخل کر کے رسید لے لیں۔ مزید اطمینان کے لئے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی بھی وہاں تعینات کر سکتے ہیں۔ حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی۔ ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ تحقیق خبر ملی ہے، کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں کل آگیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح۔ دو تو سادھو بنے ہوئے ہیں۔ دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اور دُھسّے بیچتے پھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ دو بہنگی بردار بھی ہیں۔ دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھُریاں اور تالے بیچتے ہیں۔ اور کہاں تک گناؤں۔ ہمارے یہاں تو ان کا پورا حُلیہ آگیا ہے۔"

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا بھی یقین کر لیتا ہے، جو شاید ہوش و حواس کی حالت میں وہ نہ کرتا۔ یہاں تو شبہ کا

کوئی موقع ہی نہ تھا ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو، اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں۔ اس کے لئے سیٹھ جی تیار تھے کہ اگر دو چار سو روپے دینے پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے واقعے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس سے بہتر کوئی انتظام خیال میں نہیں آتا تھا، بلکہ اسے امدادِ غیب سمجھنا چاہئے۔ انہیں کانسٹبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوالیں گے۔ دوسروں کا کیا بھروسہ۔ کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں تو غضب ہی ہو جائے۔ راستے ہی میں گھیر لئے جائیں۔ بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہو گی۔

پھر بھی اس انداز سے بولے، گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی خاص عنایت نہیں کی ہے، یہ تو ان کا فرض ہی تھا۔ میں اس عنایت کے لئے داروغہ جی کا تہِ دل سے مشکور ہوں، مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کر لیا تھا۔ کہ اگر ڈاکو اِدھر آتے تو اُن کے دانت کھٹے کر دئیے جاتے۔ سارا محلّہ مقابلہ کے لئے تیار تھا۔ سبھی سے تو اپنا یارانہ ہے۔ مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے۔ اس سے وہ بھی اپنی ذمّہ داری سے بری ہو جاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔ جیسا آپ نے خود کہا، لیکن اندر سے چیزوں کو نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں آپ کی دعا سے آدمی تو کافی ہیں، مگر کس کی نیت کیسی ہے، یہ کون جانتا ہے۔ آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہو جائے (مسکرا کر) آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے گی۔

کیسر نے اس تجویز کو لسک کہا۔ کانسٹبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی

سے پیش کیں۔ ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔

"ہم سب حضور کے تابعدار ہیں۔ اس میں مدد کی کونسی بات ہے تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں، مگر دیتے تو حضور ہی ہیں۔ آپ صرف بتاتے جایئے ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے۔"

کیسر نے خوش ہو کر کہا:۔

"بھگوان نے مدد کر دی، نہیں میں تو بہت گھبرا رہی تھی۔ جان نکلی جاتی تھی۔"

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا۔ "اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام۔ اسی مستعدی کی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تاکہ وہ آئیں تو اپنا سا منہ لے کر چلے جائیں۔"

کیسر نے چہک کر کہا۔ "کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال لے جاؤ۔"

دو کانسٹبلوں نے اندر جا کر صندوقچے اور پٹارے نکالنے شروع کئے۔ ایک باہر سامان کو کار پہ لا رہا تھا اور ہیڈ صاحب نوٹ بک پر ہر ایک چیز کا اندراج کر رہے تھے۔ زیورات، اشرفیاں، نوٹ، بیش قیمت کپڑے، شال دوشالے، نقرئی ظروف سب کار میں رکھ دے گئے۔ معمولی فرنیچر، برتن، فرش فروش اور غلہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا۔ اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لئے بے مصرف ہیں کیسر کا سنگاردان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹبل کو دے کر بولے:۔

"بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا۔"

ہیڈ صاحب نے سنگاردان لے کر کہا:۔

"میرے لئے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے"
سیٹھ جی کے دل میں ایک شُبہ پیدا ہوا۔ کہا:۔
"اس فہرست کی ایک نقل مجھے بھی دیدیجئے گا"
ہیڈ کانسٹبل نے کہا "وہ آپ کو تھانے میں باضابطہ دے دی جائیگی"
"کیوں نہ یہیں دیدیجئے؟"
"یہاں لکھنے میں دیر ہوگی۔ اور پھر جب تک داروغہ جی کا دستخط نہ ہو، اس رسید کی وقعت ہی کیا ہے؟ مگر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا"؟
سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا:۔
"شبہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھا۔ ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا"
ہیڈ صاحب نے بے رُخی سے کہا "اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا شبہ ہو۔ تو آپ چیزیں اپنے گھر میں ہی رکھیں۔ ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مگر ہاں! اس حالت میں ذمّہ داری آپ کی رہے گی"
سیٹھ جی اور نادم ہوئے "نہیں نہیں صاحب! شبہ کی بات نہیں تھی۔ یوں ہی ایک خیال آگیا۔ آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی، میں بھی مانتا ہوں"
کار پر سارا سامان رکھ دیا گیا۔ محلّے کے سینکڑوں آدمی تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کار بہت بڑی تھی مگر بالکل بھر گئی۔ پانچ آدمیوں کے لئے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے۔ باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی گویا اسکی لڑکی رخصت ہو رہی ہو۔

(۳۲)

پانچ میل کا سفر تھا۔ قصبہ سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموش اور اداسی بلندیاں نظر آئیں جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سرخ بجری کی سڑک سیندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی۔ ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹبل نے سیٹھ جی سے پوچھا:۔

"یہ کہاں تک صحیح ہے سیٹھ جی! کہ پچیس سال قبل آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے؟"

نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے:۔

"بالکل صحیح ہے خانصاحب! میرے پاس کُل تین روپے تھے لٹیا ڈور کندھے پر تھی۔ اور چھڑی ہاتھ میں۔ بس بھگوان کا بھروسہ تھا۔ بالکل تقدیر کا کھیل ہے اور بھگوان کی مرضی چاہیے، آدمی کے بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

"میں نے سُنا ہے۔ آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں؟"

"میرا اصول ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے۔ جب بہت تھوڑی آمدنی تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا۔"

"آخر یہ دولت آپ کو ملی کہاں سے؟"

"آڑھت، لین دین، رہن بیع سبھی کچھ تو ہے خاں صاحب! یہ سمجھ لیجیے کہ صبح سے آدھی رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی۔

آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا!"

"کچھ نہیں صاحب! نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ میں تو بیٹھا نگرانی کرتا ہوں"

"آپ نے کئی لاکھ پیدا کئے ہوں گے"

"دو سوا دو لاکھ کی جائیداد ہے خانصاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے۔ آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملے"

"لیکن اصل سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے؟"

"سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خانصاحب! آج چاہوں تو کہیں سے بھی لاکھوں کا مال منگا سکتا ہوں"

"آپ کی زندگی واقعی ہمارے لئے نمونہ ہے"

"آپ لوگوں کی دعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی ہے۔ آگے کی بھگوان جانے"

"اب تو اور بھی آرام سے کٹے گی، کیونکہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے"

"اس میں کیا شک ہے خانصاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے"

"یہ مال و اسباب اور جائیداد آپ کے لئے فضول ہے۔ آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں"

"بہت اچھی طرح خانصاحب! یہ سب تو مایا جال ہے جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی۔ مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے۔ اب دھرم سالہ بنوانے کا ارادہ ہے۔ سامان کر لیا ہے۔ کوئی اچھا مہورت

دیکھ کر ہاتھ لگا دیتا ہے۔ ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا ہوں۔ بس پھر بھگوان کا بھجن کرونگا۔"

"آپ کے کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں؟"

"تقدیر میں نہ تھی خانصاحب! اور کیا کہوں۔ جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں، ان کے ہاں تو گھاس پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں۔ جنہیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے، وہ اولاد کے لئے ترس ترس کر رہجاتے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، سیٹھ جی! آپ کی باتیں بڑی پُر مغز ہوتی ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسانمند ہوں گے۔"

سیٹھ جی ہنسے اور بولے۔ "بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے خانصاحب!"

ہیڈ صاحب نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "بھگوان کیوں چھڑانے لگے آپ خود کیوں نہیں چھڑا لیتے۔ جس دولت سے آپ کو اب کوئی فائدہ نہیں اُسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجئے۔ بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب؟"

"بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خانصاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے۔"

"میں تو توڑنے کو تیار ہوں۔ اسی وقت۔"

"اسی دولت کے لئے آدمی اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے خانصاحب! دغا، فریب، بے ایمانی اور ظلم کچھ اسی کے لئے کرتا ہے۔ بغیر اپنا ضمیر بیچے دولت نہیں ملتی۔ ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے۔"

"لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ملہ رہے۔

آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی۔"

"نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خانصاحب!"

"آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدی پر بیٹھے نگرانی کرنا؟"

"مگر سب آدمی سبھی کام تو نہیں کرسکتے۔"

"آخر یہ روپیہ آپ کے پاس آیا کہاں سے؟ آپ نے کسی آسامی کو سو روپے قرض دئیے۔ یقیناً اُس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی تو سو کے دو سو، تین سو، چار سو تک وصول کئے ہونگے۔ آپ کے روپے نے تو بچے دئیے نہیں۔ آسامی کی محنت کے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر آپ نے پورے خاندان کو اپنا غلام بنا لیا ہوگا۔ اور اُن کی شبانہ روز کی مشقت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی۔"

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے خانصاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے خواہ مخواہ بحث کر رہا ہے۔ مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت پیدا کی تو پھر؟ جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ بولے:-

"اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سبھی دولت مند مفت خور ہیں۔"

خانصاحب نے اس کی تائید کی۔ بیشک میں بڑے زور سے یہ دعوی کرتا ہوں۔ یہانتک کہ سبھی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ فرق یہی ہے کہ آپ آسامیوں سے روپے وصول کرکے جمع رکھ چھوڑتے ہیں سرکار اُس سے ملک کا انتظام کرتی ہے۔ عدالتیں اور پولیس قایم کرتی ہے

کہ آپ اور آپ کے بھائی بالمینان غربا کا خون چوس سکیں۔ اگر کوئی غریب سرکشی کرے، اور آپ کا منہ اپنی رگ سے ہٹا دینا چاہے، تو سرکار کی پولیس اور عدالت اور فوج آپ کی مدد کرے۔ دراصل آپ نے سُود یا نفع یا مالگذاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے وہ غریبوں کی کمائی ہے۔ جو آپ نے اُن سے جبراً چھین لی ہے۔ اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بیکار پڑی ہوئی ہے۔ آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کر کے گھر کی راہ لیجئے۔ ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں۔ انصاف کی پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا، یہاں تک کہا، کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دیجئے۔ لیکن آپ سرکاری امداد کے زعم میں بیٹھے رہے۔ مجبوراً ہمیں یہ چال چلنی پڑی"۔

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن نہیں۔ یہ پولیس والے مجھے ڈرا رہے ہیں اور میری بُزدلانہ بدحواسی کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ بولے:۔

"خانصاحب! آپ بڑے دل لگی باز ہیں لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی۔ تو اس وقت میں دھوکے میں آ چکا ہوتا"!

"تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ وہ چال چلی ہے، اور آپ دھوکے میں آ گئے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں"!

گاڑی رک گئی۔ سیٹھ جی دھکیل کر نیچے گرا دئے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ سیٹھ جی چلّاتے ہوئے موٹر کار کے پیچھے دوڑے "حضور، سرکار، بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ رحم کیجئے۔ گھر میں ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ ہمارے بڑھاپے پر رحم کیجئے۔ میں خوشی سے آپ کو

پچیس ہزار دیدونگا۔ آپ نے کہا ہے، آپ انصاف کی پولیس ہیں۔ یہ بے انصافی نہ کیجئے"۔

خانصاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا:۔

"کاش یہ پچیس ہزار آپ نے پہلے دیدیئے ہوتے۔ اب تو میعاد گذر گئی۔ اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے۔ اسکا خیال کیجئے۔ آپ کو ذرا بھی شبہ ہوجاتا تو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں، اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتیں۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیے۔ یہ وہ تین روپے ہیں، جو آپ ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ اب جاکر پھر دولت جمع کیجئے۔ دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکال لیں گے"۔

موٹر تیز ہوگئی۔ اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے۔

"دوڑو! دوڑو۔ ڈاکو مجھے لوٹے لئے جاتے ہیں"۔

لیکن وہ ساری فریاد صحرا تھی۔

غم نداری بز بخر

اُن دنوں دودھ کی تکلیف تھی۔ کئی ڈیری فارموں کی آزمایش کی۔ اہیروں کا امتحان لیا، کوئی نتیجہ نہیں۔ دو چار دن تو دودھ اچھا ملتا، پھر آمیزش شروع ہو جاتی۔ کبھی شکایت ہوتی دودھ پھٹ گیا، کبھی اس میں سے ناگوار بو آنے لگتی، کبھی مکھن کے ریزے نکلتے۔ آخر ایک دن ایک دوست سے کہا، بھئی آؤ ساجھے میں ایک گائے لے لیں۔ تمھیں بھی دودھ کا آرام ہوگا، مجھے بھی۔ لاگت آدھی آدھی، خرچ آدھا آدھا، دودھ بھی آدھا آدھا۔ دوست صاحب راضی ہو گئے۔ میرے گھر میں جگہ نہ تھی اور گوبر وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ اُن کے مکان میں کافی جگہ تھی، اس لئے تجویز ہوئی کہ گائے اُنھیں کے گھر رہے۔ اس کے عوض انھیں گوبر پر بلا شرکت غیرے اختیار رہے۔ وہ اسے کامل آزادی سے پاتھیں، اُپلے بنائیں، گھر لیپیں، پڑوسیوں کو دیں یا اُسے کسی طبی مصرف میں لائیں۔ منمقر کو اس میں کسی قسم کا اعتراض، احتجاج یا قیل وقال نہ ہوگا اور منمقر بہ صحتِ ہوش و حواس و بہ اصابتِ عقل اقرار کرتا ہے کہ وہ گوبر پر کبھی دستِ تصرف دراز نہ کرے گا، نہ کسی کو تصرف کے لئے آمادہ کرے گا۔

دُودھ آنے لگا۔ روز روز کی ضیق سے نجات ملی۔ ایک ہفتہ تک کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہوئی۔ گرم گرم دودھ پیتا تھا اور خوش ہو کر گاتا تھا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی
تازہ دودھ پلایا اُس نے — لطفِ حیات چکھایا اُس نے
دودھ میں بھیگی روٹی میری — اُس کے کرم نے بخشی سیری

خدا کی رحمت کی ہے مُورت   کیسی بھولی بھالی صورت

مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی پُرانی شکائتیں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دودھ صرف نام کا دودھ رہ گیا۔ کتنا ہی اُبالو، نہ کہیں ملائی کا پتہ نہ مٹھاس کا۔ پہلے تو شکایت کر لیا کرتا تھا، اس سے دل کا بخار نکل جاتا تھا۔ شکایت سے اصلاح نہ ہوتی تو دودھ بند کر دیتا تھا۔ اب تو شکایت کا بھی موقع نہ تھا۔ بند کر دینے کا ذکر ہی کیا۔ قہرِ درویش برجانِ درویش، پیو یا نالی میں ڈال دو۔ آٹھ آنے روز کا نسخہ نوشتۂ قسمت تھا۔ بچّہ دودھ کو منہ نہ لگاتا۔ پینا تو دور رہا، آدھوں آدھ شکر ڈال کر کچھ دنوں دودھ پلایا تو پھوڑے نکلنے شروع ہوئے اور میرے گھر میں روز بم چخ مچی رہتی تھی۔ بیوی نوکر سے فرماتیں دودھ لے جاکر انہی کے سر پٹک آ۔ میں نوکر کو منع کرتا۔ وہ کہتیں اچھے دوست ہیں تمہارے، اسے شرم نہیں آتی۔ کیا اتنا احمق ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ دودھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ گائے کو اپنے گھر منگوا لو بلا سے بدبو آئے گی، مچھر ہوں گے، دودھ تو اچھا ملے گا روپے خرچے ہیں تو اس کی لذت تو ملے گی۔ چڈھا صاحب میرے پُرانے مہربان ہیں، خاصی بے تکلفی ہے اُن سے، یہ حرکت اُن کے علم میں ہوتی ہو، اسے قیاس باور نہیں کرتا۔ یا تو ان کی بیوی کی شرارت ہے، یا نوکر کی۔ لیکن ذکر کیسے کروں۔ اور پھر ان کی بیوی سے بھی تو راہ و رسم ہے۔ کئی بار میرے گھر آچکی ہیں۔ میری دیوی جی بھی ان کے ہاں کئی بار مہمان جا چکی ہیں۔ کیا وہ یکایک اتنی بیوقوف ہو جائیں گی۔ صریح آنکھوں میں دھول جھونکیں گی۔ اور پھر چاہے کسی کی شرارت ہو، میرے لئے یہ غیر ممکن تھا کہ اُن سے دودھ کی خرابی کی شکایت کرتا۔ خیریت یہ ہوئی کہ تیسرے مہینے چڈھا کا تبادلہ ہو گیا۔ میں تنہا گائے رکھ نہ سکتا تھا۔ ساجھا ٹوٹ گیا۔ گائے آدھے داموں بیچ دی گئی۔ میں نے اس دن اطمینان کا سانس لیا۔ خیر یہ صلاح ہوئی کہ ایک بکری رکھ لی جائے۔ وہ بیچ آنگن کے

ایک گوشے میں پڑی رہ سکتی ہے۔ اُسے دوہنے کے لئے نہ گوالے کی ضرورت، نہ اس کا گوبر اٹھانے، ناند دھونے، چارہ بھوسا ڈالنے کے لئے کسی اہیرن کی ضرورت۔ بکری تو میرا ملازم بھی آسانی سے دوہ لے گا۔ تھوڑی سی چوکر ڈال دی، چلئے قصّہ تمام ہوا۔ پھر بکری کا دودھ مفید بھی زیادہ ہے۔ بچّوں کے لئے خاص طور پر زود ہضم، معتدل، صحت بخش۔ حسنِ اتفاق سے میرے یہاں جو پنڈت جی میرے مسودے نقل کرنے آیا کرتے تھے، اِن معاملات میں کافی تجربہ کار تھے۔ اُن سے ذکر آیا تو انہوں نے ایک بکری کی ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا۔ پچھائیں نسل کی بکری ہے، اونچے قد کی، بڑے بڑے تھن، جو زمین سے لگتے چلتے ہیں، بیحد کم خور، لیکن بیحد دودھا ر۔ ایک وقت میں دو ڈھائی سیر دودھ لے لیجیے۔ ابھی پہلی مرتبہ ہی بیائی ہے، ۲۵ روپے میں آجائے گی۔ مجھے دام کچھ زیادہ معلوم ہوئے لیکن پنڈت جی پر مجھے اعتبار تھا۔ فرمائش کر دی گئی اور تیسرے دن بکری آپہنچی۔ میں دیکھ کر اچھل پڑا۔ جو اوصاف بیان کئے گئے تھے اُن سے کچھ زیادہ ہی نکلے۔ ایک چھوٹی سی مٹی کی ناند منگوائی گئی۔ چوکر کا بھی انتظام ہو گیا۔ شام کو میرے خدمتگار نے دودھ نکالا تو سچ مچ ڈھائی سیر۔ میری چھوٹی پتیلی لبریز ہو گئی تھی۔ اب موسلوں ڈھول بجائیں گے۔ یہ مسئلہ اتنے دنوں کے بعد جا کے کہیں حل ہوا ہے۔ پہلے ہی یہ بات سوجھتی تو کیوں اتنی پریشانی ہوتی۔ پنڈت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ مجھے علی الصباح اور شام کو اس کے سینگ پکڑنے پڑتے تھے، تب آدمی دودھ پاتا تھا لیکن یہ تکلیف اس دودھ کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ بکری کیا ہے کام دھین ہے بیوی نے سوچا اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اس لئے اس کے تھن کے لئے ایک غلاف تیار ہوا۔ اس کی گردن میں نیلے چینی کے دانوں کا ایک مالا پہنایا گیا۔ گھر میں جو کچھ جھوٹا بچتا دیوی جی خود جا کر اسے کھلا آتی تھیں۔

لیکن ایک ہی ہفتہ میں دُودھ کی مقدار کم ہونے لگی۔ ضرور نظر لگ گئی۔ بات کیا ہے۔ پنڈت جی سے حال کہا تو اُنہوں نے کہا "صاحب دیہات کی بکری ہے زینلہ کی آبے دریغ اناج کھاتی تھی اور سارے دن باغ میں گھوما چرا کرتی تھی۔ یہاں بندھے بندھے دُودھ کم ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اسے ذرا ٹہلا دیا کیجئے"

لیکن شہر میں بکری کو ٹہلائے کون اور کہاں۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ مضافات میں مکان لیا جائے۔ وہاں بستی سے ذرا نکل کر کھیت اور باغ ہوں گے، کہار گھنٹے دو گھنٹے ٹہلا لایا کرے گا۔ جھٹ پٹ مکان تبدیل کیا اور ہر چند مجھے دفتر آنے جانے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا، لیکن اچھا دُودھ ملے تو میں اس کا دوگنا فاصلہ طے کرنے کو تیار تھا۔ یہاں مکان کشادہ تھا۔ مکان کے سامنے صحن تھا۔ ذرا اور بڑھ کر آم اور مہوے وغیرہ کا باغ۔ باغ سے نکلئے تو کاچھیوں کے کھیت تھے۔ کسی میں آلو، کسی میں گوبھی ایک کاچھی سے طے کر لیا کہ روزانہ بکری کے لئے کچھ ہریالی دے جایا کرے مگر اتنی کوشش کرنے پر بھی دُودھ کی مقدار میں کوئی خاص بیشی نہ ہوئی۔ ڈھائی سیر کی جگہ مشکل سے سیر بھر دُودھ نکلتا تھا لیکن یہ تسکین تھی کہ دودھ خالص ہے۔ یہی کیا کم ہے

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدمتگاری کے مقابلے میں بکری چرانا زیادہ ذلیل کام ہے۔ ہمارے دیوتاؤں اور نبیوں کا نہایت معزز طبقہ گلہ بانی کیا کرتا تھا۔ کرشن جی گائیں چراتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس گلہ میں بکریاں نہ رہی ہوں گی حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ دونوں ہی بھیڑیں چراتے تھے۔ لیکن انسان روایات کا غلام ہے جو کچھ بزرگوں نے نہیں کیا اُسے وہ کیسے کرے۔ نئے راستے پر چلنے کے لئے جس عزم اور پختہ یقین کی ضرورت ہے وہ ہر ایک میں تو ہوتا نہیں۔ دھوبی آپ کے غلیظ کپڑے دھو دے گا لیکن آپ کے دروازے پر جھاڑو لگانے میں اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ جرائم پیشہ اقوام کے فرد بازار سے کوئی چیز قیمتاً خریدنا اپنی شان کے خلاف

سمجھتے ہیں۔ میرے خدمتگار کو بکری لے کر باغ میں جانا برا معلوم ہوتا تھا۔ گھر سے تو لے جاتا لیکن باغ میں اُسے چھوڑ کر خود کسی درخت کے نیچے سو جاتا۔ بکری پتیاں چرتی تھی، مگر ایک دن اس کے جی میں آیا کہ ذرا باغ سے نکل کر کھیتوں کی سیر کرے۔ یوں وہ بہت ہی شستہ مزاج اور وضعدار بکری تھی۔ اس کی صورت سے متانت اور تحمل جھلکتا تھا لیکن باغ اور کھیت میں اُسے یکساں آزادی نہیں ہے، اسے وہ شاید نہ سمجھ سکی۔ ایک روز کسی کھیت میں گھس گئی اور گوبھی کی کئی کیاریاں صاف کر گئی۔ کاچھی نے دیکھا تو اُس کے کان پکڑ لئے اور میرے پاس لاکر بولا۔" بابوجی اس طرح آپ کی بکری ہمارے کھیت چرے گی تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ آپ کو بکری رکھنے کا شوق ہے تو اسے باندھ کر رکھئے۔ آج تو ہم نے آپ کا لحاظ کیا، لیکن پھر ہمارے کھیت میں گئی تو ہم یا تو اس کی ٹانگ توڑ دیں گے یا کانی ہوس بھیجدیں گے۔" ابھی وہ اپنی تقریر ختم نہ کر پایا تھا کہ اس کی بیوی آپہنچی اور اس نے اسی خیال کو زیادہ پُر زور الفاظ میں ادا کیا۔" ہاں ہاں کرتی ہی رہی مگر رانڈ کھیت میں گھس گئی اور سارا کھیت چوپٹ کر دیا۔ اس کے پیٹ میں بھوانی بیٹھیں۔ یہاں کوئی تمہارا دبیل نہیں ہے۔ حاکم ہو گے اپنے گھر کے ہو گے۔ بکری رکھنا ہے تو باندھ کر رکھو۔ نہیں گلا اینٹھ دوں گی۔" میں بھیگی بلی بنا ہوا کھڑا تھا۔ جتنی پھٹکار آج سہنی پڑی، اتنی زندگی میں کبھی نہ سہی تھی۔ اور جس تحمل سے آج کام لیا اگر اس سے دوسرے موقعوں پر کام لیا ہوتا تو آج آدمی ہوتا۔ کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ بکری کا گلا گھونٹ دوں اور خدمتگار کو ڈیڑھ سو ہنٹر جماؤں۔ میری خموشی سے وہ خاتون اور بھی شیر ہوتی جاتی تھی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر خموشی مضر ثابت ہوتی ہے۔ بارے میری اہلیہ نے گھر میں یہ غل غپاڑہ سنا تو دروازے پر آگئیں اور ہیکڑی سے بولیں" تو کانی ہوس پہنچا دے اور کیا کرے گی

!

ناحق ٹر ٹر کر رہی ہے گھنٹے بھر سے۔ جانور ہی ہے، ایک دن کھل گئی تو کیا اسکی جان لے گی۔ خبردار جواب ایک بات بھی مُنہ سے نکالی ہوگی۔ کیوں نہیں کھیت کے چاروں طرف جھاڑ لگا دیتی۔ کانٹوں سے روندھ دے۔ اپنی غلطی تو مانتی نہیں۔ اوپر سے لڑنے آئی ہے۔ ابھی پولیس میں اطلاع کردیں تو بندھے بندھے پھرو۔

اس تحکمانہ اندازِ بیان نے اِن دولوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن اِن دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوی جی کی خوب خبر لی۔ "غریبوں کا نقصان بھی کرتی ہو، اوپر سے رعب جماتی ہو۔ اسی کا نام انصاف ہے؟ دیوی جی نے اندازِ تفاخر سے جواب دیا۔ میرا احسان تو نہ مانو گے کہ شیطانوں کو کتنی آسانی سے دفع کر دیا۔ لگے اُلٹے ڈانٹنے۔ گنواروں کو راہ پر لانے کا سختی کے سوا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ شرافت یا فیاضی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اُسے یہ لوگ کمزوری سمجھتے ہیں اور کمزور کو کون نہیں دبانا چاہتا؛

خدمتگار سے جواب طلب کیا تو اُس نے صاف کہہ دیا۔ "صاحب بکری چرانا میرا کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تم سے بکری چرانے کو کون کہتا ہے۔ ذرا اُسے دیکھتے رہا کرو کہ کسی کھیت میں نہ جائے۔ اتنا بھی تم سے نہیں ہوسکتا؟"

"میں بکری نہیں چرا سکتا صاحب! کوئی دوسرا آدمی رکھ لیجیے۔"

آخر میں نے خود شام کو اُسے باغ میں چرا لانے کا فیصلہ کیا۔ اِتنے ذرا سے کام کے لئے ایک نیا آدمی رکھنا میری حیثیت سے باہر تھا۔ اور اپنے اِس خدمتگار کو جواب بھی دینا نہیں چاہتا تھا جس نے کئی سال تک وفاداری سے میری خدمت کی تھی، اور ایماندار تھا۔ دُوسرے دن میں دفتر سے ذرا جلد چلا آیا اور جھٹ پٹ بکری کو لے کر باغ میں جا پہنچا۔ جاڑوں کے دن تھے ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھی پتیاں گری ہوئی تھیں۔ بکری پتیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی، گویا مہینوں کی بھوکی ہو۔ ابھی اس درخت کے نیچے تھی، ایک پل میں وہ جا پہنچی۔ میری ذلیل ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر ذرا آرام کیا کرتا تھا، آج یہ قواعد کرنا پڑی۔ تھک گیا۔ مگر محنت سپھل ہو گئی۔ آج بکری نے کچھ زیادہ دودھ دیا۔

یہ خیال آیا اگر سوکھی پتیاں کھانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی تو یقیناً ہری پتیاں کھلائی جائیں تو اس سے کہیں بہتر نتیجہ نکلے۔ لیکن ہری پتیاں آئیں کہاں سے؟ درختوں سے توڑ دوں تو باغ کا مالک ضرور اعتراض کرے گا یقیناً ہری پتیاں مل نہ سکتی تھیں۔ سوچا کیوں نہ ایک بار بانس کے لگے سے پتیاں توڑیں۔ مالک نے شور مچایا تو اس سے منتیں کریں گے۔ راضی ہو گیا تو خیر نہیں دیکھی جائے گی۔ تھوڑی سی پتیاں توڑ لینے سے درخت کا کیا بگڑا جاتا ہے۔
چنانچہ ایک پڑوسی سے ایک پتلا لمبا بانس مانگ لایا، اس میں ایک آنکس باندھا اور شام کو بکری کو ساتھ لے کر پتیاں توڑنے لگا۔ چور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا کہیں مالک تو نہیں آرہا ہے۔ دفعتہً وہی کاچھی ایک طرف سے آنکلا اور مجھے پتیاں توڑتے دیکھ کر بولا۔ یہ کیا کرتے ہو بابو جی۔ آپ کے ہاتھ میں یہ لگا اچھا نہیں لگتا۔ بکری پالنا ہم گریبوں کا کام ہے کہ آپ جیسے سریفوں کا۔ میں کٹ گیا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔ اس میں کیا برائی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں کیا شرم، وغیرہ جوابات کچھ ہلکے، بے حقیقت، مصنوعی معلوم ہوئے۔ سفید پوشانہ خودداری نے زبان بند کر دی۔ کاچھی نے قریب آکر میرے ہاتھ سے لگا لے لیا اور آن واحد میں ہری پتیوں کا ڈھیر لگا دیا اور پوچھا۔ پتیاں کہاں رکھ آؤں؟

میں نے جھینپتے ہوئے کہا "تم رہنے دو۔ میں اٹھا لے جاؤں گا"
اس نے تھوڑی سی پتیاں بغل میں اٹھالیں اور بولا "آپ کیا پتیاں رکھنے جائیں گے۔ چلیئے میں رکھ آؤں"
میں نے برآمدے میں پتیاں رکھوا دیں۔ اسی درخت کے نیچے اس کی جو گنی ہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کاچھی نے ان کا ایک گٹھا بنایا اور سر پر لاد کر چلا گیا
اب مجھے معلوم ہوا یہ دہقان کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ کوئی بات مطلب سے خالی نہیں۔
مگر دوسرے دن بکری کو باغ میں لے جانا میرے لئے دشوار ہو گیا۔ کاچھی پھر دیکھے گا۔ اور نہ جانے کیا کیا فقرے چُست کرے۔ اس کی نظروں میں گر جانا رد سیاہ ہو جانے سے کم شرمناک تھا۔ ہماری عزت اور توقیر کا جو معیار عوام نے قائم کر رکھا ہے ہم کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ نکو بن کر رہے تو کیا رہے۔
لیکن بکری اتنی آسانی سے آزادانہ چہل قدمی سے دست بردار ہونا نہ چاہتی تھی، جسے اس نے اپنا معمول سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی اس نے اتنے زور شور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ گنگری دار میں میں کی پیہم آوازیں آ آ کر کان کے پردوں کو مجروح کرنے لگیں۔ کہاں بھاگ جاؤں؟ بیوی نے اسے گالیاں دینا شروع کیں۔ میں نے غصّہ میں آ کر کئی ڈنڈے رسید کئے مگر اس نے ستیاگرہ ملتوی کرنا تھا نہ کیا۔ عجیب عذاب میں جان تھی۔
آخر مجبور ہو گیا۔ کردۂ خویش را چہ علاج، آٹھ بجے رات، جاڑوں کے دن، گھر سے باہر منہ نکالنا مشکل، اور میں بکری کو باغ میں ٹہلا رہا تھا۔ اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اندھیرے میں پاؤں رکھتے میری روح کانپتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے سے ایک سانپ نکل گیا تھا۔ اگر اس کے اوپر پیر پڑ جاتا تو ضرور کاٹ لیتا

تب سے میں اندھیرے میں کبھی نہ نکلتا تھا۔ مگر آج اس بکری کے کارن مجھے اس خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ذرا بھی ہوا چلتی اور پتے کھڑکتے تو میری آنتیں سکڑ جاتیں اور پنڈلیاں کانپنے لگتیں۔ شاید اس جنم میں میں بکری رہا ہوں گا۔ اور یہ بکری میری آقا رہی ہوگی۔ وہی کفارہ اس زندگی میں ادا کر رہا تھا۔ برا ہو اس پنڈت کا جس نے یہ بلا میرے سر منڈھی۔ گرہستی ہی جنجال ہے۔ بچہ نہ ہوتا تو کیوں اس موذی جانور کی اتنی خوشامد کرنی پڑتی۔ اور یہ بچہ بڑا ہو جائیگا تو بات نہ سنیگا کہے گا آپ نے میرے لئے کیا کیا ہے۔ کون سی جائداد چھوڑی ہے۔ یہ سزا بھگت کر ۹ بجے رات کو لوٹا۔ اگر رات کو بکری مر جاتی تو مجھے مطلق غم نہ ہوتا۔

دوسرے دن صبح ہی سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کسی طرح رات کی بیگار سے چھٹی ملے۔ آج دفتر میں تعطیل تھی۔ میں نے ایک لمبی رسی منگوائی اور شام کو بکری کے گلے میں رسی ڈال ایک درخت کی جڑ سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ اب چرے جتنا چاہے۔ اب چراغ جلتے جلتے کھول لاؤں گا۔ تعطیل تھی ہی، شام کو سینما دیکھنے کی ٹھہری۔ ایک اچھا سا کھیل آیا ہوا تھا۔ نوکر کو بھی ساتھ لیا ورنہ بچے کو کون سنبھالتا۔ جب نو بجے رات کو گھر لوٹے اور میں لالٹین لے کر بکری لینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے رسی کو دو تین درختوں میں لپیٹ کر ایسا الجھا ڈالا ہے کہ سلجھنا مشکل ہے۔ اتنی رسی بھی نہ بچی تھی کہ وہ ایک قدم بھی چل سکتی۔ لاحول ولاقوۃ۔ جی میں آیا کمبخت کو یہیں چھوڑ دوں۔ مرتی ہے تو مر جائے۔ اب اتنی رات کو لالٹین کی روشنی سے کون رسی سلجھانے بیٹھے۔ لیکن دل نہ مانا، پہلے اس کی گردن سے رسی کھولی۔ پھر اس کی پیچ در پیچ اینٹھن چھڑائی۔ ایک گھنٹہ وقت صرف ہو گیا۔ مارے سردی کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے اور جی جل رہا تھا وہ الگ۔ یہ ترکیب اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

اب کیا کروں، کچھ عقل کام نہ کرتی تھی۔ دودھ کا خیال نہ ہوتا تو کسی کو مفت دے دیتا۔ شام ہوتے ہی چڑیل اپنی صدائے بے ہنگام شروع کردے گی اور گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اور آواز بھی کتنی کریہہ اور منحوس ہوتی ہے۔ شاستر میں لکھا بھی ہے جتنی دور اس کی آواز جاتی ہے، اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ سورگ کی بسنے والی ہستیاں جو اپسراؤں کے نغمے سننے کی عادی ہیں، اس کی مکروہ آواز سے نفرت کریں تو کیا تعجب۔ مجھ پر اس کی سامعہ خراش صداؤں کی ایسی ہیبت سوار تھی کہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہی میں گھر سے نکل بھاگا لیکن ایک میل نکل جانے پر بھی ایسا گمان ہو رہا تھا کہ اس کی آواز میرا پیچھا کئے چلی آتی ہے۔ اپنی تنگ ظرفی پر شرم بھی آرہی تھی۔ جسے ایک بکری رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو، وہ اتنا نازک دماغ کیوں بنے۔ اور پھر تم ساری رات تو گھر سے باہر رہو گے نہیں آٹھ بجے پہنچو گے تو کیا وہ گوسفندانہ نغمہ تمہارا خیر مقدم نہ کرے گا۔

دفعتاً ایک نیچی شاخوں والا درخت دیکھ کر مجھے بے اختیار اس پر چڑھنے کی تحریک ہوئی۔ سپاٹ تنوں پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں تو ۶-۷ فٹ کی اونچائی پر شاخیں پھوٹ گئی تھیں۔ ہری ہری پتیوں سے درخت لدا کھڑا تھا۔ اور درخت بھی تھا گولر کا۔ جس کی پتیوں سے بکریوں کو خاص رغبت ہے۔ میں ادھر تیس سال سے کسی رُوکھ پر نہیں چڑھا، وہ عادت جاتی رہی، اس لئے آسان چڑھائی کے باوجود میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ پر میں نے ہمّت نہ ہاری اور پتیاں توڑ توڑ نیچے گرانے لگا۔ یہاں اکیلے میں کون مجھے دیکھتا ہے کہ پتیاں توڑ رہا ہوں۔ ابھی اندھیرا ہوا جاتا ہے۔ پتیوں کا ایک گٹھر بغل میں دباؤں گا اور گھر جا پہنچوں گا اگر اتنے پر بھی بکری نے کچھ چیں چپڑ کی تو اس کی شامت ہی آجائے گی۔

میں ابھی اوپر ہی تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک غول نہ جانے کدھر سے

آنکلا اور پتیوں پر پل پڑا۔ میں اوپر سے چیخ رہا ہوں، مگر کون سنتا ہے۔ جو آئے
کا کہیں پتہ نہیں۔ کہیں دبک رہا ہوگا کہ دیکھ لیا جاؤں گا تو گالیاں پڑیں گی۔ جھلا کر
نیچے اترنے لگا، ایک ایک پل میں پتیاں غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اتر کر ایک
ایک کی ٹانگ توڑ دوں گا۔

یکایک پاؤں پھسلا اور میں دس فٹ کی اونچائی سے نیچے آ رہا۔ کمر میں
ایسی چوٹ آئی کہ پانچ منٹ تک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خیریت ہوئی کہ اوپر
اوپر سے نہیں گرا۔ نہیں تو یہیں شہید ہو جاتا۔ بارے میرے گرنے کے دھماکے
سے بکریاں بھاگیں اور تھوڑی سی پتیاں بچ رہیں۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں
نے ان پتیوں کو جمع کر کے ایک گٹھا بنایا اور مجبوروں کی طرح اسے کندھے
پر رکھ کر، شرم کی طرح چھپائے گھر چلا۔ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہوا۔ جب مکان کوئی
چار فرلانگ رہ گیا اور میں نے قدم تیز کئے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو وہ کاچھی سامنے
سے آتا دکھائی دیا۔ کچھ نہ پوچھو، اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ راستے کے
دونوں طرف کھیتوں کی اونچی مینڈیں تھیں جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے
لگے ہوئے تھے۔ اگر رستے رستے جاتا ہوں تو وہ ظالم میرے بغل سے ہو کر
نکلے گا اور خدا معلوم کیا ستم ڈھائے۔ کہیں مڑنے کا راستہ نہیں۔ اور وہ مردود
بلائے بے درماں کی طرح چلا آتا تھا۔ میں نے دھوتی اوپر سرکائی۔ چال بدل لی
اور سر جھکا کر اس طرح نکل جانا چاہتا تھا کہ کوئی مزدور ہے۔ تلے کی سانس تلے
تھی، اوپر کی اوپر۔ جیسے وہ کاچھی کوئی خونخوار شیر ہو۔ بار بار خدا کو یاد کر رہا تھا۔ یا الٰہی
تو ہی آفت زدوں کا والی و مددگار ہے۔ اس مردود کی زبان بند کر دے۔
ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں کا نور غائب کر دے....... آہ! وہ جاں گسل
لمحہ جب میں اس کے برابر ایک گز کے فاصلے سے نکلا۔ ایک ایک قدم

تلوار کی دھار پر پڑ رہا تھا، کہ شیطانی آواز کانوں میں آئی۔ "کون ہے رے کہاں سے پتیاں توڑے لاتا ہے؟"

مجھے معلوم ہوا نیچے سے زمین نکل گئی ہے اور میں اس کے گہرے شکم میں جا پہنچا ہوں۔ روئیں برچھیاں بنے ہوئے تھے، دماغ میں اُبال سا آرہا تھا، اعضا مفلوج ہو رہے تھے، جواب دینے کا ہوش نہ رہا۔ تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا، مگر وہ ارادی فعل نہ تھا۔ حفظ جان کا اضطراری عمل تھا، کہ ایک ظالم ہاتھ گھٹنے پر پڑا اور گٹھا نیچے گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں اپنے دروازے پر پسینے میں تر کھڑا تھا، گویا مرگی کے دورے کے بعد اٹھا ہوں۔ اس وقفہ میں روح پر شعور ثانی کی حکومت تھی۔ اور بکری کی وہ مکروہ آواز، وہ دلخراش آواز، وہ ہمت شکن آواز، وہ دنیا کی ساری نحوستوں کا خلاصہ، وہ دنیا کی ساری لعنتوں کی روح کان میں چبھی جا رہی تھی۔

بیوی نے پوچھا "آج کہاں چلے گئے تھے۔ اس چڑیل کو ذرا باغ میں بھی نہ لے گئے۔ جینا محال کئے دیتی ہے۔ گھر سے نکل کر کہاں چلی جاؤں۔"

میں نے تشفی دی "آج چلا لینے دو۔ کل سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے گھر سے نکال باہر کروں۔ چاہے قصاب ہی کو دینا پڑے۔"

"اور لوگ نہ جانے کیسے بکریاں پالتے ہیں۔"

"بکری پالنے کے لئے کتے کا دماغ چاہئے۔"

صبح کو بستر سے اٹھ کر اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ اس کالی بلا سے کیونکر نجات حاصل کروں کہ دفعتاً ایک گڈریہ بکریوں کا ایک گلہ چراتا ہوا آ نکلا۔ میں نے اُسے بلایا اور اس سے اپنی بکری کو چرانے کی تجویز پیش کی۔ گڈریا راضی ہو گیا۔ یہی اس کا کام تھا۔ میں نے پوچھا "کیا لو گے"

"آٹھ آنے بکری ملتے ہیں حضور"

"میں ایک روپیہ دوں گا لیکن بکری کبھی میرے سامنے نہ آئے"

گڈریا حیرت میں رہ گیا۔"مرکھنی ہے کیا بابوجی؟"

"نہیں نہیں۔ بہت سیدھی ہے۔ بکری کیا مارے گی لیکن میں اس کی صورت نہیں دیکھنی چاہتا"

"ابھی تو دودھ دیتی ہے؟"

"ہاں سیر سوا سیر دودھ دیتی ہے"

"دودھ آپ کے گھر پہنچ جایا کرے گا"

"تمہاری مہربانی"

جس وقت بکری گھر سے نکلی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری نحوست نکلی جا رہی ہے۔ بکری بھی خوش تھی۔ گویا قید سے چھوٹی ہو۔

گڈریئے نے اسی وقت دودھ نکالا اور گھر میں رکھ کر بکری کو لئے چلا گیا۔ ایسا بے غرض گاہک اُسے زندگی میں شاید پہلی ہی بار ملا ہوگا۔

ایک ہفتہ تک تو دودھ تھوڑا بہت آتا رہا۔ پھر اس کی مقدار کم ہونے لگی، یہاں تک کہ ایک مہینہ ختم ہونے ہوتے دودھ بالکل بند ہوگیا۔ معلوم ہوا بکری گابھن ہوگئی ہے۔ میں نے ذرا بھی اعتراض نہ کیا۔ کاچھی کے پاس گائے تھی اس سے دودھ لینے لگا۔ میرا نوکر خود جا کر دوہا لاتا تھا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ گڈریہ مہینے میں ایک بار آکر اپنا روپیہ لے جاتا۔ میں نے کبھی اس سے بکری کا ذکر نہ کیا۔ اس کے خیال ہی سے میری روح کو وحشت ہوتی تھی۔ وہ اگر قیافہ شناس ہوتا تو بڑی آسانی سے اپنا حق الخدمت دوگنا کر سکتا تھا۔

ایک دن میں دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ گڈریہ اپنی بکریوں کا گلہ لئے آنکلا۔ میں اس کا روپیہ لانے اندر گیا کہ کیا دیکھتا ہوں میری بکری دو بچوں کے ساتھ مکان میں آپہنچی۔ وہ پہلے سیدھی اس جگہ گئی جہاں بندھا کرتی تھی۔ پھر وہاں سے آنگن میں آئی اور شاید تعارف کے اظہار کے لئے میری بیوی کی طرف تاکنے لگی۔ انھوں نے دوڑ کر ایک بچے کو گود میں لے لیا اور کوٹھری میں جاکر مہینوں کا جمع چوکر نکال لائیں اور ایسی محبت سے بکری کو کھلانے لگیں گویا بہت دنوں کی بچھڑی ہوئی سہیلی آگئی ہو۔ نہ وہ پرانی تلخی تھی۔ نہ وہ کدورت کبھی بچے کو چمکارتی تھیں، کبھی بکری کو سہلاتی تھیں۔ اور بکری ڈاک گاڑی کی رفتار سے چوکر اڑا رہی تھی۔

تب مجھ سے بولیں۔ "کتنے خوبصورت بچے ہیں"۔

"ہاں بہت خوبصورت"۔

"جی چاہتا ہے ایک پال لوں"۔

"ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی؟"

"تم بڑے نرموہیے ہو"۔

چوکر ختم ہوگیا۔ بکری اطمینان سے رخصت ہوگئی۔ دونوں بچے بھی اس کے پیچھے پھدکتے چلے گئے۔ دیوی جی آنکھ میں آنسو بھرے یہ تماشہ دیکھتی رہیں۔

گڈریے نے چلم بھری اور گھر میں آگ مانگنے آیا۔ چلتے وقت بولا "کل سے دودھ پہنچا دیا کرونگا مالک"۔

دیوی جی نے کہا۔ "اور دونوں بچے کیا پئیں گے؟"

"بچے کہاں تک پئیں گے بہو جی! دو سیر دودھ دیتی ہے۔ ابھی دودھ

اچھا نہ ہوتا تھا اس مارے ہیں لایا۔"

مجھے رات کا وہ روح شکن واقعہ یاد آگیا۔

میں نے کہا "دودھ لاؤ یا نہ لاؤ تمہاری خوشی۔ لیکن بکری کو ادھر نہ لانا۔"

اس دن سے پھر نہ وہ گڈریہ نظر آیا اور نہ وہ بکری۔ اور نہ میں نے سراغ لگانے کی کوئی کوشش کی۔ لیکن دیوی جی اس کے بچوں کو یاد کرکے کبھی کبھی آنسو بہا لیتی ہیں۔

مفت کرم داشتن

ان دنوں حسنِ اتفاق سے حاکمِ ضلع ایک صاحبِ ذوق بزرگ تھے جنہوں نے تاریخ اور قدیم سکّہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انہیں ان مشاغل کے لئے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے، اور ان کا غائبانہ مدّاح تھا۔ لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلّف تھا کہ اگر میری جانب سے پیشقدمی ہوئی تو عام تجربہ کے مطابق وہ میری حکام جوئی پر محمول کی جائے گی۔ اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں تو حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں مدعو کرنے کا بھی مخالف ہوں۔ اور جب کبھی سنتا ہوں کہ کسی افسر کو کسی رفاہِ عام کے جلسہ کا صدر بنایا گیا، یا کوئی اسکول یا شفا خانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا، تو برادرانِ وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں۔ مگر جب ایک دن حاکمِ ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے بنگلہ پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا جواب دوں۔ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا۔ انھوں نے کہا صاف کہہ دیجئے مجھے فرصت نہیں، وہ حاکمِ ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے کوئی سرکاری یا ضابطہ کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا۔ لیکن ذاتی ملاقات کے لئے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آتے

اس سے کیا اُن کی شان میں بٹہ لگا جاتا تھا۔ اسی لئے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بُلایا کہ وہ حاکم ضلع ہیں۔ اِن احمق ہندوستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انھیں اپنا عُہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں ہندوستانی افسروں کے کئی پُرمذاق تذکرے سنائے۔ "ایک افسر صاحب سُسرال گئے شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا، جیسا عام رواج ہے۔ خُسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا۔ کہا بیٹیا ابھی کتنے دنوں کے بعد آئی ہے تین مہینے بھی نہیں ہوئے بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو۔ ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعہ پیغام کہلا بھیجا ابھی میں جانا نہیں چاہتی۔ آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے کچھ تمہارے ہاتھ بک تھوڑے ہی گئی ہوں۔ میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے، جامہ سے باہر ہو گئے۔ خسر پر سمن جاری کر دیا بیچارہ بڈھا آدمی دوسرے دن صاحبزادی کو لے کر داماد کی خدمت میں حاضر ہوا تب جا کے اُس کی جان بچی" یہ لوگ ایسے خر دماغ ہوتے ہیں۔ اور پھر تمھیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے۔ اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے فوراً گرفتار ہو جاؤ گے مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لئے قانون گوئی یا نائب تحصیلداری کی فکر تمھیں ہے نہیں۔ پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار بند ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے، تنگ ظرفی ہے۔ بیشک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانہ پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی۔ وضعدار آدمی بے تکلف چلا آتا، لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں افسانہ نگاروں کی

میز پر مدعو ہونے میں وزیرِ اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے لیکن یہ ہندوستان ہے، جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لئے جمع رہتا تھا۔ اور اب بھی تاجپوشی کے موقع پر ہمارے اہلِ قلم بن بُلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، قصیدے پیش کرتے ہیں، انعام پاتے ہیں، تو تم ایسے کہاں کے وہ ہو کہ حاکم ضلع تمہارے گھر پر چلا آئے۔ وہ افسر ہے تم معمولی مضمون نگار ہو جب تم میں اس قدر اکڑپن اور تنک مزاجی ہے تو پھر وہ ضلع کا بادشاہ ہے اگر اُسے کچھ غرور بھی ہو تو جائز ہے۔ کمزوری کہو، حماقت کہو، خر دماغی کہو، لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمہارے گھر نہیں آئے۔ ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمہارے یہاں کہاں تھا۔ گت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو ہے توفیق روپیے کے دو سگار پینے کی۔ کہاں وہ سگار ملتا ہے۔ اس کا کیا نام ہے۔ اس کی خبر ہے تمہیں! اپنی تقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے تمہیں بُلا لیا۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدانخواستہ اور تمہاری شامتِ اعمال سے کہیں اُن کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی۔ ان کی مہمان نوازی تم یا تمہاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمہارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمہارے لئے موت کا سامنا ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پُرانے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو۔ لیکن کوئی بھی خوددار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لئے مایۂ تفریح ہے۔ ان لیڈی صاحب کے سامنے تمہاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اُس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجودیکہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی، لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم

انھوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔" افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا اُن کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے۔ انھوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی گپ شپ کی اور واپس آیا۔ کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعہ کو ذرا بھی اہمیت نہ دی گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے جانے کیسے اس کی خبر لگا لی خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں مبالغہ نے میری رفعت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لئے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اہل غرض باؤلے ہوتے ہیں تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ میرے ذریعہ ان کی مطلب براری ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لیکر میرے پاس آئے کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی۔ کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختیوں سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اور اس کے بعد کے آدمیوں کو ترقیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہٰذا اس قسم کی کوئی نہ کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی۔ لیکن میرے پاس ان سب کے لئے ایک ہی جواب تھا "مجھ سے کوئی مطلب نہیں"

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کوئی ۴۵ سال کی پرانی بات ہے۔ میری عمر ۸ یا ۹ سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب

اسی عمر کے، مگر مجھ سے کہیں توانا اور فربہ تھے۔ میں ذہین تھا وہ حد درجہ کے غبی، مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انھیں سبق پڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی، میں اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی تھپی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہوگئی۔ بلدیو چل نکلا اور خالق باری تک آپہنچا مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہوگئے۔ تب سے بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار راستے میں دیکھا (میں اب بھی ہی منحنی ہوں وہ اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا آؤ بھئی بلدیو مزے میں تو ہو۔ کیسے یاد کیا۔ کیا کرتے ہو آجکل؟

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا "زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمھاری بدولت چار حرف پڑھ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں، نہیں مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے گرد ہو بھائی۔ سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمہارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے"

یہ کہکر انھوں نے مجھے پُر عزت نظروں سے دیکھا۔ میں نے باچشم تر کہا میں تو جب تمھیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمھارے گلے سے لپٹ جاؤں ۵۰ سال کی مدّت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے"

بلدیو نے بھی رقت آمیز لہجہ کے ساتھ جواب دیا "میں نے تو بھی تمھیں ہمیشہ اپنا گُرو اور رہنما سمجھا ہے۔ جب تمھیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا

بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑے پر کبھی دغا نہ دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں ہو گھلتے کیوں جاتے ہو گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اُڑائے جاتا ہوں۔ ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لئے مرمٹے کوئی پوچھتا ہے تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹے پانی کو نہ پوچھے اس لئے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں وہی جو بڑا لڑکا ہے اُس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے۔ اچھا خاصہ پہلوان ہے۔ کسی سے دبتا نہیں داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہو گئی تب سے اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے، ادھر گاؤں میں ایک ڈاکہ پڑ گیا، داروغہ جی نے تحقیقات میں اُسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتہ سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ جی کی گہری دوستی ہے ضرور سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اُس کی جان بچ سکتی ہے۔ نہیں اور کوئی اُمید نہیں ہے۔ سزا تو ہو گی ہی، عزت خاک میں مل جائے گی۔ تم جا کر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو، بچپن کے ساتھی ہو، انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہئے۔ افسر ضلع سے تمہاری دوسری طرح کی ملاقات ہے تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے، لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے اتنا سمجھ لو، اور بالکل جھوٹا۔ نہیں میں تمہارے پاس نہ آتا لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیئے ڈالتی ہے۔ بیوی نے دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا میں دودھ پی لیتا ہوں، لیکن دونوں ساس بہو تو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں۔ اگر سزا ہو گئی تو دونوں مر جائیں گی۔ میں نے بھی کہا سب کو ڈھارس

دیا ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے اور سلامت ہے کوئی ہمارا بال بانکا نہیں کر سکتا"

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اگر پھر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو یہ نسمر ہو جائے گا۔ گلا نہ چھوڑے گا۔ کوئی جواب نہ سوجھا آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔

"تم جا کر کہہ دو۔ تقدیر میں جو ہے وہ تو ہو گا ہی"

"اچھی بات ہے"

"تو کل جاؤ گے"

"کل ہی جاؤں گا"

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا، اور آرام سے کھانا کھا لیٹا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسا دیا تھا۔ میں پہلے سے جتا چکا تھا کہ حکام عام طور پر پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا

میں اس واقعہ کو بالکل بھول گیا تھا، کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیو سنگھ بولے "بالکل بری ہو گیا۔ بھائی صاحب نے دارو غہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ دارو غہ جی بہت پشیمان ہوئے جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے دارو غہ صاحب کو جھک کر سلام کیا

بچا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمہاری سفارش کی برکت ہے۔ برادر اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی۔ میں تمہارے پاس بہت ڈرتے ڈرتے آیا تھا، لوگوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس ناحق جاتے ہو۔ وہ بڑا بے مروّت آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے ضرورتمندوں کا کام نکلے وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنتے ہی نہیں یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔ لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سُنی۔ میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تم چاہے کتنے ہی روکھے اور بے مروّت ہو لیکن مجھ پر ضرور رحم کروگے"

یہ کہکر ملبدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھر اُٹھا لایا جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ میں برابر کہے جاتا تھا۔ کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا ہی نہیں۔ جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مُفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

قاتل کی ماں

(۱)

رات کو رامیشوری سوئی، تو کیا خواب دیکھتی ہے، کہ دلّو د نے کسی افسر کو مار ڈالا ہے۔ اور کہیں رُوپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدو کوب کر رہی ہے۔ اور تمام شہر میں شور و شر برپا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھُل گئی۔ دیکھا تو دلّو د سوتا تھا۔ اُٹھ کر دلّو د کے پاس گئی۔ پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی، اور سوچنے لگی، میں نے کیا بے سر پیر کا خواب دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ متفکر بھی ہو گئی۔ پھر لیٹی۔ مگر نیند نہ آئی۔ دل میں ایک خوف سما گیا تھا۔

صبح دلّو د نے ماں کو متفکر دیکھ کر پوچھا "اماں! آج اداس کیوں ہو"

ماں دلّو د کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی "بیٹا! تم سے کیا کہوں۔ رات کو میں نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو۔ اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہے"

دلّو د نے ہنسکر کہا "تو کیا تم چاہتی تھیں۔ کہ میں پکڑا لیا جاتا؟"

ماں نے کہا "میں تو چاہتی ہوں۔ کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ۔ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اُٹھے۔ ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ دوسروں کو مار کر خود جینا میرے دھرم کے خلاف ہے"

دلّو د۔ "یہ دھرم؛ و نیتی کا زمانہ نہیں ہے"

ماں۔ دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی ہوگی۔ سوراجیہ قتل وخون سے نہیں ملتا۔ تیاگ تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے لالچ چھوڑتے نہیں، بُری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی بُرائیاں دیکھتے نہیں اس پر دعویٰ ہے، سوراجیہ لینے کا! یہ سمجھ لو، جو سوراجیہ قتل وخون سے ملیگا۔ وہ قتل وخون ہی پر قایم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملیگا وہ مُلک کی چیز ہوگی۔ افراد کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ افراد کی چیز ہوگی۔ اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام کریگا۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں۔ قتل وخون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔"

ونود نے کہا۔ "تم تو جیسے سٹیج پر کھڑی ہوکر بولتی ہو۔ یہاں کون سُننے والا ہے!"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! تم ہنستے ہو، اور میرا جی دُکھی ہے۔ کئی دنوں سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے۔ یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے۔"

ونود نے کہا۔ "میں مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ابھی کون سا سکھ بھوگ رہے ہیں، جو مصیبتوں سے ڈریں۔"

یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(۳)

آج صبح ہی سے ونود کا پتہ نہ تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ رامیشوری نے پہلے تو سمجھا، کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا۔ لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اُسے فکر ہوا۔ دس بجے کے بعد وہ کہیں نہ رُکتا تھا۔ پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو۔ رات کا خواب اُسے بے چین وپریشان کرنے لگا۔ اور

وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ جب شام ہوگئی۔ تو اس سے نہ رہا گیا کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہیں آیا۔

رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہوگیا۔ وہ خواب مجسم بن کر اُسے ڈرانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چُپ چاپ کھڑی رہی پھر خیال آیا۔ شاید گھر گیا ہو۔ فوراً گھر لوٹی۔ لیکن یہاں ونود کا اب تک پتہ نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا تھا' اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی۔ اُس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ خیالات اور بھی خوفناک صورت اختیار کرنے لگے۔ کوئی دیوی اور دیوتا نہ بچا جس کی اُس نے منّت نہ مانی ہو۔ کبھی صحن میں آکر بیٹھ جاتی' کبھی دروازے پر جاکر کھڑی ہوتی' اسکا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند کبھی نشیمن میں آبیٹھتا' اور کبھی شاخ پر۔ کھانا پکانے کا خیال کسے تھا۔ بار بار یہی سوچتی' بھگوان! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے۔ جس کی سزا دے رہے ہو۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کرو۔ میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں۔ اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے' ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ بھی بیکس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اسکا ساتھ دیتی ہوں۔

(۲۳)

نصف شب گذر چکی تھی۔ رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی شخص نہایت تیزی سے دوڑا ہوا آیا۔ او

دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا جسے اُس نے اسطرح اوڑھ لیا تھا۔ کہ مُنہ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

ایشوری نے ڈر کر پوچھا "کون ہے؟"

وہ ونود تھا۔ جلدی سے اندر داخل ہو کر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ پھر آنگن میں آکر کمبل کو رکھ دیا۔ اور کھانے کو مانگا۔

ایشوری نے خائف ہو کر پوچھا "تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمہیں ڈھونڈتی رہی۔"

ونود نے قریب آکر کہا "میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے۔ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں۔ کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکونگا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وہی کیا، جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ حفاظت جان کی خاطر مجھے یہاں سے بھاگ جانا ضروری ہے۔

ایشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولی "کیوں بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا۔ ایشور نے تمہاری بدھی کیوں ہر لی۔"

ونود نے کہا "نہ ایشور نے میری بدھی ہری ہے، نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے۔ میں نے آج چھاونی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے۔ ایسا نشانہ مارا کہ ایک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ ہلا تک نہیں۔"

"کیا وہاں اور کوئی نہ تھا؟"

"کوئی نہیں۔ بالکل سناٹا تھا۔"

"پولس کو خبر تو ہو گئی ہوگی؟"

"ہاں! کئی شخص پکڑے گئے ہیں۔ میں تو صاف بچ نکلا۔"

ایشوری کی حالت بدل گئی۔ بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصہ

سے سُرخ ہوگئیں۔ بولی "میں اسے بچا نہیں کہتی۔ کہ مُجرم تو مُنہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری کوکھ سے ایسا کپوت پیدا ہوگا، ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کرلے۔ ورنہ اُن بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہوگا۔"

یہ پھٹکار سُن کر دِنود کو غصّہ آگیا۔ بولا۔ "تمہارے کہنے سے میں خونی نہیں ہوا جاتا۔ اور لوگ یہی کام کرتے ہیں، تو لیڈر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی جے جے کار ہوتی ہے۔ لوگ اُن کی پُوجا کرتے ہیں۔ میں نے کیا تو ھتیارا ہوگیا؟"

رامیشوری "ھتیارا تو تُو ہے ہی۔ اور جو دوسروں کی ھتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ھتیارے ہیں۔ تیری ماں ہوکر میں بھی پاپ کی حصّہ دار ہوگئی میرے مُنہ میں بھی سیاہی لگ گئی۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے مرتے ہیں۔ جو دوسروں کی حفاظت کرے، وہی بہادر اور سُورما ہے۔ انہیں کا جنم مبارک ہے۔ انہیں کی مائیں خوش نصیب ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کرکے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔"

دِنود نے پھر کمبل اُٹھالیا۔ اور بولا "تم میری نہ ہوتیں۔ تو اسی وقت لگے ہاتھ تمہارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمہارا مُنہ نہ دیکھونگا۔"

یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا۔

(۴)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اسی جوش میں گھر سے نکلی۔ بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ ناانصافی نہیں گوارہ کر سکتی۔ وہ اسی وقت کوتوالی میں جاکر اس خون کی خبر دے دیگی۔ دِنود کا پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہ

پھانسی ہو

لیکن کچھ دُور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ لَوٹ پڑی اور گھر آکر خوب روئی جس بیٹے کو اُس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا، کیا اُسے پھانسی دلا دے گی؟

لیکن پھر خیال آیا۔ اُن بیچاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی۔ جو بے گناہ پھانسی پائیں گے۔ انہیں بھی تو اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے نہیں نہیں وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی۔ اُسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے، مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہوگا۔

رامیشوری اسی اُلجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ جب کوئی راستہ نہ نظر آتا تو وہ رونے لگ جاتی تھی۔ پھر سوچتی، کیوں نہ خودکشی کر لوں۔ کہ تمام دُکھوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اس کی موت سے اُن بے گناہوں کی جان تو نہ بچے گی اُن ماؤں کا کلیجہ تو نہ ٹھنڈا ہوگا۔ وہ اس پاپ سے تو نہ آزاد ہوں گی۔ وہ اپنے آپ ہی بول اُٹھی۔ خواہ کچھ ہو، میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی۔ اجلاس میں جا کر صاف صاف کہہ دوں گی کہ گنہگار میں ہوں۔ کیونکہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے۔ ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ دونوں کو پھانسی دیجیے میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی، خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی وجود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے۔ ہاں! میں اپنی آنکھوں سے اس کو پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی، کیونکہ میں نے اسکو جنم دیا ہے۔ بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں۔ میں کمزور ہوں، پاپن ہوں ہتیاری ہوں۔

رامیشوری بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۵)

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اُس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا، مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اسی لئے بیٹے کو جنم دیا تھا، اسی لئے پالا پوسا تھا، کہ ایک دن اُسے پھانسی پر چڑھتے دیکھوں گی۔ ونود اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ آج اسی ونود سے اسکا ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا، کہ وہ اُسے چھاتی سے لگائے پھرتی تھی۔ بڑے سے بڑے دُکھ جھیل کر بھی خوش تھی۔ ایک دن یہ ہے کہ وہ اُسے پھانسی دلانے جا رہی ہے۔ ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے۔ اُس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا۔ آہ! فرض کا رستہ کس قدر دشوار گذار ہے۔ ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اُس کا آخری بوسہ لینے کے لئے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟

رامیشوری ونود کو سزا دینے جا رہی تھی، جوشِ محبت سے بھری ہوئی۔

(۶)

ایک ہفتہ گذر گیا۔ پولیس نے سازش کا پتہ لگا لیا۔ شہر کے دس نوجوان گرفتار کر لئے گئے۔ انھیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا۔ اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہو گیا۔

ونود کا اسی دن سے پتہ نہ تھا۔ رامیشوری محبت اور فرض کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانواڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر! کبھی فرض کلیجے کو مضبوط کر دیتا، کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی، لیکن جوں جوں دن گذرتے تھے، فرض لپا ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی دلیلیں اسکے

احساسِ فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں۔ جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہوگی۔ یہی سب سے زبردست دلیل تھی سات سات دنوں میں اُس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے تھے۔ اور وہ پانی بھی آنکھوں کے راستے سے نکل جاتا تھا۔ ایسی ہو گئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ۔

دس بجے کا وقت تھا۔ وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی۔ اسی وقت وہ روزانہ ایک بار ونود کا پتہ لینے کے لئے یہاں آیا کرتی تھی۔

ناگہاں اس نے نو دس نوجوانوں کو ہتکڑیاں پہنے ایک درجن مسلح پولیس کے سپاہیوں کے پنجہ میں گرفتار دیکھا۔ پیچھے تھوڑی دور پر کچھ مرد عورت سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا "کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟"

سپاہی نے کہا "کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مار یگا؟"

"کون مارا گیا۔ ہے؟"

"ایک پولیس کے سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔"

"کانگریس کے آدمی ہنسا نہیں کرتے۔"

"قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔"

رامیشوری دم بھر وہیں کھڑی رہی۔ پھر انھیں لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی۔ فرض یہ نئی طاقت پا کر سنبھل گیا ہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منہ میں نہ جانے دے گی۔ اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لئے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

(۷)

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا۔ رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا۔ "کیا صاحب آ گئے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں آئے۔ آتے ہی ہونگے۔"

"بہت دیر سے آتے ہیں۔ بارہ تو بجے ہونگے۔"

اردلی نے جھنجھلا کر کہا۔ "تو کیا وہ تمہارے نوکر ہیں۔ کہ جب تمہاری مرضی ہو آ کر بیٹھ جائیں؟ بادشاہ ہیں، جب مرضی ہوگی آئیں گے!"

رامیشوری چُپ ہو گئی۔

اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نے پوچھا "کیوں بہن! تمہارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟"

رامیشوری اپنے فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی کچھ نہ بولی۔

اُس عورت نے پھر کہا۔ کیا کہوں۔ نہ جانے کس پاپی نے خون کیا آپ تو منہ میں سیاہی لگا کر چھپ رہا اور ہم لوگوں کے متھے گئی۔"

کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ رامیشوری بھی رونے لگی۔

ایک ضعیف عورت اُسے سمجھانے لگی۔ "بہن! چُپ ہو جاؤ۔ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ میرا تو بیٹا بالکل بے قصور پکڑا گیا ہے۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمہارا کون گرفتار ہے؟"

رامیشوری نے اُسے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی۔ "صاحب کب تک آئیں گے؟"

دو بجے صاحب کی موٹر آئی۔ اجلاس میں ہل چل مچ گئی۔ جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا۔ پولیس کے افسر آ گئے۔ ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔

عین اُسی وقت رامیشوری نے اجلاس کے روبرو آکر سلام کیا۔ اور صاف لفظوں میں بولی "حضور! اس مقدمہ کے پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

سب کے سب اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔

صاحب نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "کیا بات ہے؟"

رامیشوری۔ "میں اس لئے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمہ کا سچا حال بیان کر دوں۔ سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں!"

صاحب نے متحیّر ہو کر پوچھا "تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟"

رامیشوری نے کہا "میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اور بالکل سچ کہتی ہوں۔ سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اسکا نام ونود بہاری ہے میرے گھر میں اسکا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اُسی دن سے لاپتہ ہو گیا ہے میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اُسے اسی طرح پیار کرتی ہوں۔ جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ ایک ہفتہ پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا۔ لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اُس نے یہ خون کیا۔ تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لئے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انہیں بے اولاد دنیا کر میں اولاد والی نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔"

کمرے میں ہل چل مچ گئی۔ مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اُس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی۔ نہ کچھ سوجھتا تھا، نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ بس وِنود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکایک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا، اور اُس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا "ارے تو ہے وِنود!" اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔